Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

1969

تقریبِ یومِ پاکستان

قائدِ اعظم کا ارشاد

(حیدر آباد۔ دکن میں)

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ — پاکستان — دس روپے
سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے
سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان : ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/ بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور

جلد ۲۲ | مارچ ۱۹۶۹ء | نمبر ۳

فہرست

۱ ۔ لمعات ـــــــــ ۲
۲ ۔ جماعتِ اسلامی اور دیارِ عرب میں پاکستان کا تعارف ـــــ (شاہد عادل) ـــ ۹
۳ ۔ اسلام کا معاشی نصب العین ـــــــــ ۲۲
۴ ۔ حقائق و عبر ـــــــــ ۳۴
۵ ۔ گھر کی شہادت ـــــــــ ۴۵
۶ ۔ ہندو کیا ہے ؟ ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــ ۴۹

ایڈیٹر ۔ محمد خلیل ، ناشر ۔ سراج الحق ، مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/ بی گلبرگ لاہور ، پرنٹر ۔ شیخ محمد اشرف ، مطبوعہ ۔ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جب حالات نا مساعد ہو جائیں تو اُس وقت یہ کہنا کہ ـــ کیوں ہم نہ کہتے تھے ـــ کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن طلوع اسلام نے ارباب حل و عقد سے جو کچھ اس سے پہلے کہا اُس کا جذبۂ محرکہ بھی تنقید و تعریض نہیں تھا اور جو اب عرض کیا جائیگا اُس کا مقصد بھی طعن و تشنیع نہیں۔ اُس وقت بھی مقصود اصلاح و تعمیر تھا اور اب بھی مطلوب آئندہ کے لئے احتیاط اور حسنِ تدبیر ہے۔ قارئینِ طلوع اسلام کے اوراق الٹ کر دیکھیں تو یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ ہم برسوں سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ

(۱) ملک کے معاشی حالات اس قدر ابتر ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ غریب آدمی تو ایک طرف، متوسط الحال طبقہ کے لئے بھی زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو چکے ہیں۔ آبادی میں روز افزوں اضافہ، مشینوں کے استعمال سے افرادی قوت (MAN - POWER) کا عضوِ معطل بن کر رہ جانا اور اس طرح بیکاروں کی تعداد کا کثرت سے بڑھتے جانا، دوسری طرف شخصی منفعت سازی (PRIVATE ENTERPRISE) سے اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہوش رُبا اضافہ، اور ایک مخصوص و محدود طبقہ میں دولت کے بے پناہ اکتناز کی وجہ سے قیمتوں کا چڑھتے چلے جانا۔ ان عوامل کی وجہ سے کم، یا متعین آمدنی والے افراد اور خاندانوں کے لئے زندگی وبالِ دوش بن رہی ہے۔ اس کا علاج پیوند سازی سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے معاشی نظام کو تبدیل کیا جائے۔ ہم کس قدر خوش بخت ہیں کہ قرآن کریم نے ـــ جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے ابدی ضابطہ حیات ہے ـــ ایک ایسا معاشی نظام دیا ہے جس میں نہ وسائلِ پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت کے انبار لگے رہتے ہیں۔ اس سے پورے کا پورا معاشرہ مرفہ الحال ہو جاتا ہے اور طبقاتی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا تھا ـــ اور باصرار و تکرار کہا تھا ـــ کہ انسان اور سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن بھوک برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھوک کی اضطراری حالت کو قابلِ فہم قرار دیتے ہوئے اسے حرام تک کھا لینے کی اجازت دی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حرام، لحمِ خنزیر، دمِ مسفوح (بہتا ہوا لہو) اور مردار تک محدود نہیں۔ اس میں ہر وہ چیز آجاتی ہے جس کا حصول و استعمال عام حالات میں ناجائز ہو۔ یہ وجہ تھی جو ہم ارباب حل و عقد کی

خدمت میں بار بار گزارش کرتے رہتے کہ لوگوں کی بھوک کا جلد از جلد مداوا کریں ورنہ یہ لاوا ایک دن پھوٹ بہیگا، اور اس صورتِ حال سے یا تو ملک کے شر پسند عناصر ناجائز فائدہ اٹھا جائینگے یا اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا سیلاب بلا ادھر کا رُخ کر لیگا ــ ہم یہ کہتے رہے اور اربابِ اقتدار نے سنی کو ان سنی کر دیا۔

(۲) ہم مسلسل بیس برس سے اپنی اس پکار کو دہراتے رہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم بیحد ناقص ہے' اگر اسے صحیح قرآنی نظام سے نہ بدلا گیا تو ہماری نئی نسل ایک "بے سری فوج" بن کر رہ جائیگی جو کسی کے کنٹرول میں نہیں رہے گی۔ ہمارے غلط معاشرہ میں' والدین اور اولاد اور استاد اور شاگرد کے رشتوں کے پرانے بندھن ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے نوجوانوں کو' زندگی کی مستقل اقدار سے روشناس نہ کرایا اور ان کے دل و دماغ میں ان کے لئے جذبۂ احترام و خود سپردگی بیدار نہ کیا' تو سرکشی ان کا شعار' اور حدود شکنی ان کی روشِ زندگی بن جائے گی۔ ہم یہ کہتے رہے اور کسی نے اس پر کان نہ دھرا۔ نتیجہ یہ کہ غلط نظامِ تعلیم' اور تعلیم یافتہ طبقہ کی روز افزوں بیکاری اور خواری نے ہمارے نوجوانوں کو ایک ایسا بھک سے اُڑ جانیوالا آتش گیر مادہ بنا دیا جسے بس ایک فتیلہ دکھلا دینے کی ضرورت تھی۔

(۳) ہم نے کہا ــ اور بار بار کہا ــ کہ افسر کلاس کے تحکمانہ رویّہ سے خلقِ خدا تنگ آچکی ہے۔ انہیں اسکا احساس ہی نہیں کہ انگریز کا زمانہ لَد چکا ہے اور اب اہلِ پاکستان کی اپنی حکومت ہے۔ اب کوئی شخص اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ زبان سے اپنے آپ کو 'عوام کے خادم" (پبلک سرونٹس) کہنے والے عوام کے سر پر فرعون بنکر مسلط رہیں۔ حکام کا یہ رویّہ ہی عوام کے لئے کچھ کم نفرت انگیز نہ تھا کہ اس پر رشوت کی ہمہ گیر وبا نے قاعدہ' قانون' ضابطہ اور نظام کا رہا سہا وقار بھی خاک میں ملا دیا۔ اور ملک میں' قانون کی حکمرانی کے ادعا کے باوجود' لاقانونیت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس فضا میں جہاں ایک طرف بد دیانت طبقہ کے وارے نیارے ہو گئے' دوسری طرف' دیانتدار' فرائض شناس' قانون پسند طبقہ پر زیست حرام ہو گئی۔ معاشرہ اور سرکار دربار میں' عزت کا معیار دولت اور صرف دولت رہ گیا۔ خواہ وہ کسی طریق سے حاصل کی گئی ہو' شرافت' نجابت' حسنِ سیرت و کردار' جنس کاسد بن کر رہ گئے جن کا اس بازار میں کوئی خریدار اور پُرسانِ حال نہ رہا۔ معاشی ناہمواریوں کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ایک طرف افراطِ زر سے پیدا ہونے والے جرائم و عیوب عام ہو گئے اور دوسری طرف غربت اور افلاس کے تخلیق کردہ ذمائم و نمائم چاروں طرف پھیل گئے۔ ایسے جو شرافت و دیانت کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تو معاشرہ میں "چوراُچکا چوہدری' اور غنڈی رَن پردھان" بن گئے۔ نتیجہ یہ کہ ہر شریف انسان ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہو گیا۔

معاشرے میں یہ حالات عام ہوتے چلے گئے۔ اور ان کی اصلاح کے لئے' نہ یہ کہ کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا گیا' بلکہ بے موقع اور بے محل جابرانہ اقدامات سے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا گیا۔

(۴) ملک میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے جس کا "پیشہ لیڈری" ہے۔ ۱۹۵۸ء کے عسکری انقلاب سے پہلے ان حضرات

کے لئے اپنی منفعت کوشیوں کے لئے میدان بڑا وسیع تھا۔ مغربی پاکستان کے تین صوبوں میں، تین گورنر، تین قانون ساز اسمبلیاں۔ ان میں وزرائے اعظم، وزراء اور پارلیمانی سیکرٹریوں کا ایک لشکر۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد وزارتوں کے ٹوٹنے سے، ایک گروہ کی جگہ دوسرے گروہ کی باری ۔۔۔ مُردہ دوزخ میں جاتے یا جنت میں، ان کے جلوے مانڈے کا سامان وافر موجود تھا۔ ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد یہ سارے میدان سُکڑ اور سمٹ کر رہ گئے۔ "لیڈری پیشہ" حضرات بیکار ہو گئے۔ ملک میں نظم و نسق کی اُن بدعنوانیوں، اور معاشرہ کی اُن خرابیوں نے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے لئے فضا سازگار بنا دی۔ آتشگیر مادہ پہلے سے موجود تھا۔ انہوں نے اسے قتیلہ دکھایا اور ملک اس خلفشار اور انتشار کی بھٹی میں جھونک دیا گیا جس کا الم انگیز منظر ہر دیدۂ عبرت کو خون کے آنسو رُلا دینے کے لئے کافی ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ تغیر چاہنے والے ارباب سیاست میں سب کے سب حصولِ جاہ و منصب کے لئے ایسا چاہتے تھے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو دیانتداری سے تبدیلیٔ احوال کے خواہاں تھے۔ لیکن ملک میں بیشتر عنصر ایسا ہی تھا جو مفادِ خویش کے لئے انتشار پھیلانا چاہتا تھا۔

لیکن مصلحانہ تبدیلیٔ احوال کے خواہاں حضرات ہوں یا مفادِ خویش کی خاطر انتشار پسند لوگ، ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ اس کیلئے جو طریق اختیار کیا گیا اس سے انہیں (بزعمِ خویش) فوری کامیابی بے شک حاصل ہو گئی، لیکن یہ طریق آخر الامر ملک اور قوم (بلکہ خود ان کے اپنے لئے بھی) سخت مضرت رساں ثابت ہوگا۔ ان حضرات کا دعویٰ یہ تھا (اور ہے) کہ وہ بحالیٔ جمہوریت کے لئے تبدیلیٔ آئین کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ان کا یہ دعویٰ صحیح تھا تو اس کے لئے انہیں طریق بھی جمہوری اور آئینی اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ تبدیلیٔ احوال کا ایک طریق یہ ہے کہ فریقِ مقابل کو اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیا جائے۔ کسی کو اس طرح مجبور کرنے کا ایک ذریعہ خالص قوت ہوتا ہے۔ لیکن اسکا دوسرا طریق وہ ہے جسے عصرِ حاضر کی "گاندھیانہ سیاست" (GANDHIAN POLITICS) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی قانون شکنی، انتشار انگیزی اور خلفشار خیزی سے ملک کے نظم و نسق کو اس درجہ معطل اور تباہ کر دیا جائے کہ فریقِ مقابل، ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جائے۔ قوت کا استعمال انقلابی طریق سے کیا جائے یا گاندھیانہ سیاست کی رُو سے، بہرحال تبدیلیٔ بہ جبر کہلائیگا۔ اس کے برعکس، دوسرا طریق یہ ہے کہ عوام کی اکثریت رائے سے آئینی تبدیلی عمل میں لائی جائے، اسے جمہوری طریق قرار دیا جائیگا۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے جو طریق اختیار کیا گیا وہ "تبدیلیٔ بہ جبر" کا طریق تھا۔ اس سے عاجلانہ مفاد تو میسر حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قوم کے دل میں یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ دوسرے سے اپنی بات منوانے کا مؤثر طریق ہی یہ ہے کہ ملک میں قانون شکنی اور انتشار پسندی کو عام کر دیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں ذہنیت اس قسم کی پیدا ہو جائے تو اس ملک میں نظم و نسق کی عمارت کی بنیادیں کبھی مستحکم نہیں ہو سکتیں۔ اس میں ہر وقت

اس خطرہ کا سامنا رہتا ہے کہ معلوم عوام کو حکومت کی کونسی بات ناگوار گذرے اور وہ قانون شکنی پر اتر آئے۔ قانون شکنی کی تلوار دو دھاری ہوتی ہے۔ آج اسے جو گروہ موجودہ حکومت کیخلاف استعمال کرتا ہے کل کو عوام یہی تلوار خود اِن کی حکومت کے خلاف استعمال کرینگے۔ قرآن کے الفاظ میں وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۔ (۳۵/۴۳)۔ یہ حربے پلٹ کر پھر انہی کو گھیر لیتے ہیں جنہوں نے انہیں وضع اور استعمال کیا تھا۔ قانون شکنی کی ذہنیت سیدھا راستہ نہیں ہوتی جو کسی نہ کسی مقام پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ دائرۂ اسفل (VICIOUS-CIRCLE) ہوتا ہے جو کسی مقام پر ختم نہیں ہوتا بلکہ پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اسکے پلٹنے کا وقت اور انداز کیا ہوگا اور غالب خستہ" کے بعد یہ سیلاب بلاکس کے گھر جائیگا" اور وہاں کیا تباہی مچائے گا۔ پنجابی زبان میں ایک بڑی کا مؤثر تمثیل اور کہاوت ہے۔ ایک شخص کھڑا تھا کہ اس کے پاؤں کے بیچ میں سے ایک خرگوش نکل گیا۔ اس نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ خرگوش پاؤں کے درمیان میں سے نکل گیا تو کونسی قیامت آگئی جو تم نے اس طرح شور مچانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ "میں سیئے تواُنے نئیں روندا۔ میں پیئے نوں رونا واں"۔ یعنی میں اس لئے نہیں روتا کہ یہاں سے خرگوش نکل گیا ہے رو تا یوں ہوں کہ اسے اب گذرگاہ سمجھ لیا جائے گا، تو معلوم اس کے بعد کیا کیا اس راستے سے گزرنا شروع کر دے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس جبری طریق تبدیلیٔ احوال کو جس نے بھی شروع کیا یا اس کی حوصلہ افزائی کی' اس نے ملک اور قوم کی کوئی خدمت نہیں کی۔ اس نے ایک نہایت خطرناک طرح ڈال دی۔ اس نے ایسی روش کی بنیاد رکھ دی جسکے نتائج و عواقب ملک اور قوم کے مستقبل کے لئے کبھی خوش آئند قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ حکومت نے جو روش اختیار کر رکھی تھی' اس کی رو سے' انتخابات کے ذریعے' تبدیلیٔ آئین و تغیرِ احوال کا امکان نہیں تھا۔ معاف فرمائیے۔ ہم اس دلیل کی محکمیت کے قائل نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کا یہ دعویٰ مبنی برحقیقت تھا کہ عوام کی معتدبہ اکثریت آپ کے ساتھ ہے' اور سچے دل سے ساتھ ہے — تو حکومت جو حربے بھی جی چاہے استعمال کر لیتی' انتخابات میں اس قسم کے عوام کو کبھی شکست نہیں دے سکتی تھی۔ آپ کا جبری طریق کار اختیار کرنا تو خود اس امر کا غماز ہے کہ عوام درحقیقت آپ کے ساتھ نہیں۔ وہ اس "جمہوری تماشہ" میں' ایک ہنگامی سیلاب کیطرح اُمنڈ آئے تھے۔ اس امر کا آپ کو بھی یقین نہیں تھا کہ اس ہنگامی جوش کے فرو ہو جانے کے بعد' عوام فی الحقیقت آپ کا ساتھ دینگے' اس لئے آپ نے اس ہنگامی جوش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قوت کا استعمال ہر حال میں ناجائز اور نامناسب ہوتا ہے۔ قرآن پر ایمان رکھنے والا ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے۔ لیکن قوت کے جائز اور ناجائز استعمال کے لئے ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ جس قوت کے استعمال کو آپ عقل و فکر اور دلائل و براہین کی رو سے (قرآنی سند کے ساتھ) صحیح ثابت کر دیں' وہ جائز اور مناسب

ہوگی۔ اور جس قوت کے جواب میں آپ "کیوں" کا جواب نہ دے سکیں وہ جائز نہیں قرار پا سکے گی۔ گزشتہ ہنگاموں میں عوام کیطرف سے جس قوت کا استعمال ہوا ہے اسکا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جو لوگ (مثلاً) ٹریفک سگنل توڑ رہے تھے کیا وہ اس سوال کا کوئی جواب دے سکتے تھے کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ یا جنہوں نے (مثلاً) ریلوے انکوائری آفس کا سامان توڑا پھوڑا تھا وہ بتا سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ تو رہی عوام کی حالت۔ اس تحریک کے راہنماؤں کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ اس کے جواز کے لئے کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اسے (PUBLICLY) تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ قوت کے اس استعمال کے مؤید ہیں حالانکہ انہیں اس کا خود اعتراف ہے کہ انہیں جس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ عوام کی انہی کارروائیوں کی بدولت ہوئی ہے۔ اگر ان حضرات کے یہ دعاوی صحیح تھے کہ

(۱) وہ عوام کیطرف سے ان تشدد آمیز کارروائیوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور

(۲) عوام اُن کے ساتھ ہیں۔

تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے عوام کو ان کارروائیوں سے روکا کیوں نہیں۔ اگر وہ کہیں کہ انہوں نے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن عوام نے ان کی بات نہیں مانی تو ان کا یہ دعویٰ باطل قرار پاتا ہے کہ عوام انکے ساتھ ہیں۔ اور اگر عوام فی الواقعہ انکے ساتھ ہیں تو جو کچھ عوام نے کیا ہے ظاہر ہے کہ اسے ان راہنماؤں کی تائید حاصل تھی۔ اور ان راہنماؤں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو اسلام کی اجارہ داری کے مدعی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ غور فرمائیے کہ مودودی صاحب لاہور میں بیٹھے ہفتوں لوٹ مار کی ان کارروائیوں کو خاموش تماشائیوں کیطرح دیکھتے رہے اور جب یہ سب کچھ ہو چکا اور وہ فاتحانہ انداز سے مذاکرات میں شرکت کے لئے راولپنڈی تشریف لے گئے۔ تو وہاں جا کر فرمایا کہ "اسلام لوٹ مار اور غنڈہ گردی کی مذمت کرتا ہے اور رسول اللہؐ نے لوٹ مار کرنے اور املاک کو مالِ غنیمت سمجھنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔" (نوائے وقت ۱۹-۲-۶۹)

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

ان ہنگاموں میں متاع و املاک کا جو ضیاع ہوا سو ہوا۔ ان میں اخلاقی اقدار کی جس طرح مٹی پلید کی گئی وہ کسی قوم کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتی۔ ان دنوں میں اتنے جھوٹ بولے گئے، اسقدر افترا پردازیاں ہوئیں، اسقدر فریب انگیز (WHISPERING CAMPAIGN) ہوئی، بدزبانی اور فحش کلامی کے اسقدر شرمناک مظاہرے ہوئے کہ اسکے احساس سے ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ان تمام مکذوبات و مفتریات، غنڈہ گردی اور شرانگیزی، فحش کلامی اور بدزبانی کی جو فصل کاٹی گئی، اسے قابلِ فخر کامیابی قرار دیا جا رہا ہے۔ یا للعجب! یہ ہے ہماری وہ اخلاقی سطح جس کا ہم نے دنیا کے سامنے مظاہرہ کیا ہے۔

بہرحال، ملک میں جو ہنگامے برپا ہوئے ہمارے نزدیک ان پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اربابِ اقتدار کی ناعاقبت اندیشی نے عوام میں عدمِ اطمینان پیدا کیا اور اربابِ سیاست نے غیر منطقی قوت کے استعمال سے عدمِ تدبر کا ثبوت دیا ۔۔۔ اور حاصل اسکا یہ کہ ملک تباہی اور بربادی کا نشانہ بن گیا۔ میر تقی کے الفاظ میں

دل یوں کہے کہ آنکھوں نے مجھ کو کیا خراب　　　آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے ہم کو ڈبا دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے میرؔ عشق میں　　　دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

———— (۰) ————

آخرالامر، عقل و ہوش، جذبات پر غالب آگئے اور فریقین، معاملات کو فکر و تدبر کی رُو سے سلجھانے پر آمادہ ہو گئے۔ صدرِ مملکت نے حزبِ مخالف کے اراکین کو گفتگو سے مصالحت کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ لیکن افسوس کہ اس دوران میں بھی ملک میں ہنگامہ خیزیوں کے واقعات بدستور رونما ہوتے رہے، حالانکہ صدر نے ابتدائی مطالبات بھی ایک ایک کرکے مان لئے تھے۔ ملک کی اسطرح بے محابا تباہی سے صدر ایوب کا دل بھر آیا۔ اور انہوں نے بالآخر ایک ایسا اقدام کیا جو تاریخ میں یادگار رہیگا ۔۔۔ ان تمام ہنگاموں میں صدر کی ذات کو ہدفِ طعن و تشنیع بنایا گیا تھا اور یہ کہہ کر عوام کو مشتعل کیا جاتا تھا کہ ایوب صاحب مدت العمر کے لئے صدر بنے رہنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے آج ۲۱ فروری کی شام ریڈیو پر یہ اعلان کرکے کہ وہ آئندہ الیکشن میں صدارت کے عہدہ کیلئے بطور امیدوار کھڑے نہیں ہونا چاہتے، اس الزام کی حتمی تردید کر دی۔ ان کے یہ الفاظ کہ "پاکستان میری زندگی کا سرمایہ ہے اور اس کی خاک کے ذرّے ذرّے سے مجھے محبت ہے۔۔۔ عہدے اور اقتدار آنی جانی چیزیں ہیں۔ پاکستان قائم و دائم رہیگا۔" اور سوز و گداز کے وہ رقت آمیز جذبات جن سے انہوں نے یہ الفاظ نشر کئے ۔۔۔ انکے خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ خدا کرے کہ انکا یہ جذبۂ صادق ملک کے لئے نویدِ امن و سلامتی کا پیامبر ثابت ہو۔

طلوعِ اسلام کی دشواری یہ ہے کہ یہ ایک ماہوار مجلہ ہے جو شائع تو ہوتا ہے ہر ماہ کی یکم کو لیکن اسکی کاپیاں پریس میں بہت پہلے بھیجنی ہوتی ہیں۔ اسلئے جب ہم کسی حالیہ معاملہ پر تبصرہ کرتے ہیں اور جس وقت وہ تبصرہ قارئین کے سامنے آتا ہے اسمیں خاصہ وقفہ پڑ جاتا ہے اور اس وقفہ کے دوران بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔ لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ آنے والے دنوں میں حالات کیا کروٹ بدلیں۔ اِسوقت تک جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ بحالیٔ جمہوریت کی تحریک کے علمبرداروں نے دعویٰ تو یہ کیا تھا کہ وہ سب کچھ عوام کی بہبود کے لئے کر رہے ہیں لیکن اِسوقت تک جو مطالبات انہوں نے پیش کئے ہیں ان میں عوام کی مشکلات کا نہ کوئی حل نظر آتا ہے نہ تجویز۔ وہ مطالبات تقسیمِ اختیارات اور تبدیلیٔ اقتدار کے نقطہ کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ عوام کو ان امور سے کچھ دلچسپی نہیں۔ اسلئے عوام اگر ان کی طرف سے مایوس ہوتے ہیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ ویسے بھی بھان متی کے کنبے کے یہ افراد تو آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائینگے۔

اسکے بعد میدان میں وہ عنصر باقی رہ جاتا ہے جو سوشلزم کا داعی ہے۔ سو اول تو یہ لوگ ابھی تک اتنا ہی واضح نہیں کر سکے کہ "اسلامی سوشلزم" سے ان کی مراد کیا ہے اور کس طرح "غیر اسلامی سوشلزم" سے مختلف ہے۔ البتہ اتنا واضح ہے کہ یہ حضرات "سوشلزم" کے ساتھ اسلام کے دعویدار ہونیکے باوجود اس انقلاب کو اُس طریق سے لانا چاہتے ہیں جسکی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں۔ مسٹر بھٹو نے اپنی حالیہ تقریر میں کہا ہے کہ

> حکومت بدلنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلا طریقہ انتخابات کا ہے اور دوسرا طریقہ تمام حربے اختیار کرکے انقلاب بپا کرنے کا۔ (نوائے وقت - $\frac{۲}{۶۹}$ ۱۹)

مارکسی سوشلزم کا تو یہ اصول ہے کہ اس انقلاب کے لئے جو حربہ بھی استعمال کیا جائے جائز اور درست ہے لیکن اسلام اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا کہ اپنے مقصد کے حصول کیلئے خواہ وہ کیسا ہی مقدس اور بلند کیوں نہ ہو کوئی ناجائز حربہ استعمال کیا جائے۔ اسکے نزدیک ناجائز اور باطل ذرائع سے حاصل کردہ مقصد بھی ناجائز اور باطل ہی قرار پائے گا۔ اس باب میں جماعت اسلامی بیشک ان حضرات کی حریف ہو سکتی ہے کیونکہ انکے امیر (مودودی صاحب) کا بھی مسلک یہ ہے کہ زندگی کی عملی ضروریات کیلئے جھوٹ بولنا نہ صرف شرعاً جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے لیکن جس اسلام کے احیاء کے لئے اس خطہ زمین کو حاصل کیا گیا تھا اس میں تو اس کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ ہمارے نزدیک "اس مملکت کی سالمیت" اسمیں بسنے والوں کی فلاح و بہبود" اور پاکستان کی آئیڈیالوجی کے استحکام کی اسکے سوا کوئی صورت نہیں کہ ــــ

(۱) یہاں قلب و نگاہ کی تبدیلی سے قرآن کا وہ معاشی نظام نافذ کیا جائے جس میں تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں اور فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہنے پاتی۔

(۲) نظامِ تعلیم میں ایسی تبدیلی کی جائے جس سے قرآن میں بیان کردہ مستقل اقدار تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سیرت و کردار کی بنیاد قرار پائیں۔

(۳) قرآن کریم کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے "ملت کے لئے ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جائے جو ہمارے موجودہ تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اور

(۴) جب تک طبقاتی تفریق ختم نہ ہو" ملک کی پارلیمان میں نیابت "مختلف طبقوں کی آمدنی کی نسبت سے ہو۔ (اسکی تفصیل ہم طلوع اسلام میں پہلے دے چکے ہیں)۔

جو جماعت اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے میدان میں آئے گی وہی پاکستان کی سچی بہی خواہ ہوگی اور اسی کی تحریک کو اسلامی کہلانے کا حق پہنچے گا۔ دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

شاہراہِ عادل

جماعتِ اسلامی
ــــ اور ــــ
دیارِ عرب میں پاکستان کا تعارف

جماعتِ اسلامی کے سربراہوں کے ارض القرآن کے دو سفرناموں کے تقابلی مطالعہ[عہ] کے دوران، ہم نے وعدہ کیا تھا کہ کسی آئندہ صحبت میں ہم ان تفصیلات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کرینگے جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ جماعتِ اسلامی نے پاکستان اور بانیٔ پاکستان کا دیارِ عرب میں کن الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ ان سطور سے مقصود اسی وعدہ کا ایفا ہے۔

جیسا کہ قارئین طلوعِ اسلام معلوم کر چکے ہیں، جماعتِ اسلامی نے عرب ممالک میں اپنے پروپیگنڈے کے لئے ایک خصوصی ادارہ "دار العروبۃ" کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔ یہ ادارہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے، عام طور پر، مندرجہ ذیل ذرائع سے کام لیتا ہے۔

(۱) جماعتِ اسلامی کی اہم شخصیتوں کی جانب سے دیارِ عرب کے سفر۔
(۲) عربی زبان میں اپنے پروپیگنڈہ لٹریچر کی اشاعت۔ اور
(۳) دنیائے عرب کی اہم شخصیتوں سے نجی خط و کتابت۔

ان میں سے تیسرے ذریعے کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہماری اس تک رسائی ممکن نہیں۔ اس کے بعد ہمارے پاس صرف دو ہی ذرائع باقی رہ جاتے ہیں جن سے ہم آئندہ صفحات میں تفصیلات نقل کرینگے۔ ان تفصیلات سے اس حقیقت کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ نجی خط و کتابت کے ذریعے، جس کے شائع ہونے کا بہت کم امکان ہوتا ہے، کیا کچھ کیا جاتا ہوگا۔

عہ شائع شدہ، طلوعِ اسلام ۔ بابت جنوری ۱۹۷۹ء

جماعتِ اسلامی اور نظریۂ پاکستان

ان تفصیلات کو پیشِ خدمت کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے متعلق جماعتِ اسلامی کا جو نقطہ نظر تھا اسے مختصر الفاظ میں خود انہی کی زبانی نقل کر دیا جائے تاکہ اس مضمون کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ علاوہ بریں ہم نے اس کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی ہے کہ آجکل یہ حضرات عوام کے حافظے کی روایتی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، یہاں تک کہنے لگ گئے ہیں کہ خود نظریۂ پاکستان کا تصور ان کے امیر مودودی صاحب نے دیا تھا۔

اب ملاحظہ فرمائیں کہ جس وقت پاکستان کی جنگ اپنے نازک ترین دور میں داخل ہو چکی تھی، یہ حضرات کیا فرماتے تھے۔ امیرِ جماعتِ اسلامی نے اپنی کتاب مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم میں لکھا تھا۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں، وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے[۱]

اس کی مزید تفصیل ملاحظہ ہو۔

> پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا، اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے[۲]

ضمناً آجکل یہ حضرات "جمہوریت" کے نعرے لگا رہے ہیں اس کا امیرِ جماعتِ اسلامی کی مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں جائزہ لیجئے۔

قیامِ پاکستان اور جماعتِ اسلامی

نظریۂ پاکستان کی مخالفت کے باوجود جماعتِ اسلامی کے بعض اراکین یہ سمجھتے تھے کہ اس نازک وقت میں، جبکہ برصغیر کی تقسیم کی بنیاد پر انتخابات لڑے جا رہے تھے اور جو مسلمانوں کی ملّی زندگی کے لئے ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے، جماعتِ اسلامی سے متعلقین، اور نہیں تو مسلم لیگ سے باہر رہتے ہوئے کم از کم اپنے ووٹ تو اس کے حق میں ڈال دیں۔ اس بارے میں مودودی صاحب کی طرف رجوع کیا گیا اور ان سے براہ راست ایک سوال پوچھا گیا۔ چونکہ یہ سوال اور اس کا جواب اس مسئلہ پر گہری روشنی ڈالتے ہیں اسلئے ہم ان دونوں کو، جماعتِ اسلامی کے رسالہ ترجمان القرآن سے نقل کرتے ہیں:-

---

[۱] مسلمان اور سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ صفحہ ۱۳۲ ، [۲] ایضاً۔ صفحہ ۱۳۶

سوال :۔ اس وقت مسلمانانِ ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں۔ اوّل کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر بین تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روحِ اسلامی سراسر مفقود ہے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعہ سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کرے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے۔ اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مترادف ہے۔ اس کے مقابلے میں لیگ کی تحریک اگرچہ غیر اسلامی ہے لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے۔ لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں؟ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم درپیش ہے اور یہ انتخابات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر زبردستی مسلط ہو کر رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹ پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں۔[۱]

سوال آپ نے دیکھ لیا۔ مودودی صاحب کی طرف سے اس سوال کا لمبا چوڑا جواب دیا گیا تھا۔ ہم اس جواب کا صرف وہی ٹکڑا نقل کرتے ہیں جس کا تعلق انتخابات سے تھا۔

جواب :۔ .... ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔[۲]

---

۱ ماہنامہ ترجمان القرآن۔ جلد ۲۷ عدد ۳، ۴ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸

۲ ایضاً صفحہ ۱۸۹

(ضمناً اس حقیقت کو سامنے رکھیئے کہ مودودی صاحب کے فتویٰ کی رُو سے، زندگی کی اہم ضرورتوں کے لئے جھوٹ تک بولنا بھی جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ بہرحال) مولانا کے اس جواب پر جماعت کے متعلقین حیران رہ گئے۔ اخباروں میں بھی اس پر بحث ہوئی جس کا ایک دفعہ پھر مولانا نے ایک مفصل جواب ترجمان القرآن میں دیا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ لکھا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اسلام اور اس کے مقاصد سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیجئے کہ اس کے لحاظ سے لیگ کی تحریک مسلمانوں کو کوسوں دور لئے ہی جا رہی ہے۔ لیکن محض قومی مفاد کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو مجھے وہ فضا کہیں نظر نہیں آتی جس کے متعلق خبر دی جا رہی ہے کہ وہ بڑی ہی کوئی سازگار فضا ہے۔"[۵]

چنانچہ قیام پاکستان کے سلسلے میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں یہ فیصلہ دیا گیا کہ

ہمارے نزدیک اس مقصد تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کا سیاسی نظام جس ڈھنگ پر چل رہا ہے اور جس راہ پر وہ آگے بڑھتا نظر آ رہا ہے اس سے فی الحال ہم قطع نظر کر لیں۔ اور اپنی ساری قوت اس بنیادی کام پر صرف کریں جس کے ذریعے سے نظام زندگی میں اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔[۶]

لیکن مودودی صاحب کی سخت مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آ گیا اور یہ صاحب اس "کافرانہ حکومت" میں بظاہر پناہ لینے لیکن درحقیقت اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے، اپنے لاؤ لشکر سمیت آ دھمکے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد بھارت کی پالیسی یہ تھی کہ مسلم ممالک کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت کے بیج بو دیئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ان کی طرف سے، ان ممالک میں مسلسل یہ پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا کہ پاکستان یورپی استعمار کا پیدا کردہ ہے۔ جناح، انگریزوں کا ایجنٹ تھا اور تقسیم ہند کا تصور انہی کے سیاسی ذہن کی اختراع تھا۔ ان کا یہ پراپیگنڈہ کس قدر خطرناک تھا، اس کے متعلق خود مودودی صاحب کی زبان سے سنیئے۔

ہندوستان نے پچھلے کئی برس سے بلکہ تقسیم کے فوراً بعد سے عرب ممالک کے اندر اپنے پراپیگنڈے کا وسیع جال پھیلائے رکھا ہے اور ہم یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ پروپیگنڈا اپنے تنوع اور ہمہ گیریت کے لحاظ سے بظاہر بڑا اثر انگیز اور خطیر تھا۔ ہندوستان نے بڑے بڑے ہندو فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں اور سیاسی لیڈروں کے افکار و نظریات وسیع پیمانے پر عربی زبان میں منتقل کئے، اپنے اکابر کی زندگیوں پر تصنیفوں کے انبار لگا دیئے۔ بعض

---

[۵] ماہنامہ ترجمان القرآن، جلد ۲۸ صفحہ ۱۶۳ (عدد ۳) - [۶] ایضاً - صفحہ ۱۵۵

عربی اخبارات کی درپردہ خدمات حاصل کیں جنہوں نے ہندوستان کے پراپیگنڈے کو فروغ دینے کے ساتھ پاکستان کا چہرہ مسخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ سفارتی سطح سے الگ ایک مستقل پروپیگنڈہ مشینری کا نظام قائم کیا جس میں تجربہ کار اہل قلم اور عربی دان سکالروں کو بھاری معاوضے دے کر مختلف میدانوں میں ہندوستان کی برتری کا سکہ جمانے کی خدمت پر مامور کیا۔ (ترجمان القرآن۔ نومبر ۱۹۶۵ء۔ صفحہ $\frac{۱۹۵}{۵۱}$)

یہ تو تھا ہندوستان کا پروپیگنڈہ۔ اب دیکھئے کہ خود جماعتِ اسلامی نے اس سلسلہ میں کیا کارنامے سرانجام دیئے۔

دیارِ عرب میں تحریکِ پاکستان کا تعارف

دیارِ عرب میں جماعتِ اسلامی کا تعارف کرانے کے لئے، دارالعروبۃ کے ناظم مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں جو شائع ہونے سے پہلے وہاں کے عربی رسالوں میں قسط وار شائع ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام غربۃ الاسلام فی الھند تھا۔ مولانا جب ۱۹۴۹ء میں دیارِ عرب کے دورے پر تشریف لے گئے تو وہاں کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب کو ایک نیا نام "تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان" دیا گیا۔ مجلہ چراغ راہ کے "مسعود عالم نمبر" میں اس کتاب کے متعلق جہاں یہ تصریح ملتی ہے کہ "۱۹۵۲ء کے شروع میں (انہوں نے ندوی مرحوم نے) اپنی کتاب تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان مکمل کر لی"[۵۴] اس کے بعد عربی ہی میں اس کا خلاصہ "نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و باکستان" کے نام سے لکھنا شروع کیا جو نومبر یا دسمبر ۱۹۵۲ء میں مکمل ہوا۔ اس کا کچھ حصہ مسعود صاحب قیام بغداد ہی کے زمانے سے ماہنامہ "لسان الدین" (مراکش) کو بھیجنے لگے تھے جو اس کے کئی پرچوں میں قسط وار شائع ہوا۔[۵۵]

مولانا مسعود عالم ندوی (مرحوم) ایک مخلص انسان تھے۔ لیکن جب انسان کسی جماعت سے منسلک ہو جاتا ہے تو پھر اسے جماعت کی پالیسی کو بہرحال نبھانا پڑتا ہے۔ مولانا کی مذکورہ بالا کتابوں میں تحریکِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا اس کا نوٹس لینے والا تو شاید کوئی نہیں تھا لیکن دوسری مذہبی جماعتوں کے متعلق انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، تو خود ان کی علمی زندگی کے پرانے ساتھی بھی ان سے خفا ہو گئے تھے۔ مثلاً جب نظرۃ اجمالیۃ شائع ہوئی تو اس میں مولانا الیاس (مرحوم) کی تبلیغی جماعت کا ذکر تو صرف نصف صفحے پر مشتمل تھا اور کتاب کا اکثر حصہ جماعتِ اسلامی کے لئے مخصوص تھا۔ ہندوستان

---

۵۴ تکمیل کے بعد اسے دمشق شائع ہونے کے لئے بھیج دیا گیا۔

۵۵ ماہنامہ چراغ راہ۔ مسعود عالم نمبر۔ صفحہ ۱۳۸

میں اہل ندوہ کی اکثریت کا رجحان تبلیغی جماعت کی طرف تھا۔ اس لئے ان کی طرف سے اس کتاب پر بڑی سختی سے تنقید کی گئی۔ چونکہ یہ کتاب جماعتِ اسلامی کی پالیسی کی نقیب تھی اس لئے اس کا جواب مولانا مسعود عالم کے بجائے جماعت کے کسی دوسرے اہلِ قلم نے دیا۔ اور پھر معترضین کی جانب سے جواب الجواب شائع ہوا۔ اس سلسلہ میں مولانا ندوی مرحوم کے ایک پُرانے ساتھی مولانا علی میاں ندوی نے لکھا۔

ان کی کتاب "نظریۃ اجتماعیۃ" شائع ہوئی تو حسب معمول انہوں نے مجھے بھیجنے میں پیش دستی کی۔ کتاب پر سرسری نظر ڈالی تو اس میں چند خلاء محسوس ہوئے اور بعض مباحث کسی قدر تشنہ۔ خیال تھا کہ ان کو نجی خط میں اس طرف توجہ دلاؤں گا۔ ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک عزیز نے اس پر تبصرہ اور تنقید کی۔ اس تنقید میں کچھ شوخی اور طنز کی جھلک آگئی اور قلم حدود سے تجاوز کر گیا۔ اس کا جواب جماعتِ اسلامی کے ایک پُرجوش رفیق نے تلخ لہجہ میں دیا۔ اس کا جواب الجواب بھی اسی لہجہ و انداز میں شائع ہوا۔[۹]

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، مولانا ندوی مرحوم نے، جماعتِ اسلامی کی برتری ثابت کرنے کے لئے مذہبی جماعتوں کے خلاف جو کچھ لکھا اس کا نوٹس لینے والے تو کثیر تعداد میں موجود تھے اس لئے ان کی کتاب کے اس حصے پر لے دے بھی ہوئی۔ لیکن انہوں نے پاکستان کے خلاف جو زہر اگلا اس کا نوٹس لینے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس وقت کی حکومتیں اپنے سیاسی دھندوں میں الجھی ہوئی تھیں اس لئے انہیں کہاں فرصت تھی کہ اس طرف دھیان دیتیں۔

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

لیکن بھلا ہو ماہنامہ چراغِ راہ کا کہ اس نے "مسعود عالم ندوی نمبر" میں مولانا کی مذکورہ بالا اہم کتاب کے اس باب کا، جو تحریکِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے متعلق تھا، ترجمہ شائع کر دیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہم

تحریکِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان

ان عربی کتابوں کے لمبے چوڑے اقتباس نقل کرنے کی کوفت اور ترجمہ کی ذمہ داری سے بچ گئے۔ اس کتاب میں ندوی مرحوم لکھتے ہیں۔

اس تحریک (یعنی مسلم لیگ) کی ابتداء اگرچہ اس صدی کے ابتدائی تین دہوں کے بعد ہو چکی تھی تاہم ۱۹۳۶ء کے بعد کہیں جا کر اس نے اپنا اثر پیدا کرنا شروع کیا اور اسے قبولِ عام حاصل ہوا۔

---

[۹] ماہنامہ چراغِ راہ۔ مسعود عالم نمبر۔ ص ۵۶۔

جب کہ محمد علی جناح جیسے دستوری اور قانونی مسائل کے ماہر نے اس کی باگ ڈور سنبھالی۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ ان کا قائد محمد علی جناح دستوری و قانونی مسائل میں مہارت تامہ رکھنے اور انگریز اور ہندو کی سیاست کی ساری گہرائیوں اور باریکیوں سے واقف ہونے کے باوجود اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبیوں سے قطعاً نابلد تھا۔ جناح مرحوم کو اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی سہی لیکن فی الحقیقت وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لئے بہترین اصول بھی بتائے ہیں جو انسانیت کو برکتوں سے مالا مال کرنے کے ضامن ہیں۔ یہ کچھ ان کا اپنا قصور نہیں تھا۔ بلکہ جس ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے یہ اس کا فطری لازمی نتیجہ تھا۔ ایک اسماعیلی گھرانے میں خالص فرنگی طرز پر انہوں نے نشوونما پائی۔ اسماعیلی گروہ اپنے افکار و عقاید کے اعتبار سے دراصل عام مسلمانوں سے بالکل الگ ہے۔ اور سوائے اس کے کہ دونوں اسلام ہی کا نام لیتے ہیں' ان میں باہم اور کوئی ربط نہیں . . . . یہی حال ان تمام لوگوں کا بھی تھا جو ان کی دعوت پر کانگریس کے خلاف ایک جھنڈے تلے جمع ہوتے تھے۔ یہ سب کے سب فرنگی تہذیب و ثقافت میں رنگے ہوئے اور کالجوں سے نکلے ہوئے تھے۔ ان کی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی جسے دین اور علم دین سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اس صورتِ حال کے منطقی نتیجہ کے طور پر محمد علی جناح اور ان کے پیچھے چلنے والوں کے سارے کام سیاسی مطالبات کو منوانے کے لئے سارے طور طریقے' بالکل عام سیاسی پارٹیوں ہی کی طرح تھے۔ وہی ان کے جلسوں اور کانفرنسوں کا رنگ ڈھنگ تھا . . . . . دینی و اخلاقی قیود سے وہ یکسر آزاد تھے۔ ان کی کاروائیوں اور جلسوں میں اسلام کا کوئی اثر نہیں تھا جو غیر مسلموں سے انہیں ممتاز رکھتا۔ ملک کے دوسرے حصوں اور مختلف گاؤں اور شہروں میں مسلم لیگ کی قیادت ایسے ہی ہاتھوں میں آئی جو اپنے اکابر کی طرح دین سے دور اور جن کی زندگیاں مختلف اخلاقی برائیوں میں آلودہ تھی۔" نلہ

یہ تھا تحریک پاکستان اور بانیٔ پاکستان کا تعارف جو جماعتِ اسلامی کی "پاکستان دوست" مساعی کے صدقے اسلامی ممالک میں ہوا۔

آگے چلئے — فرماتے ہیں۔

قائد اعظم اور مسلمان اور اسلام کا فرق

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلام اور مسلمان کے فرق کو سمجھا نہیں یا

نلہ ماہنامہ چراغ راہ۔ مسعود عالم نمبر۔ صفحہ ۱۶۱/۱۶۲

سمجھنا چاہتا ہیں۔ اسلام دین و دنیا کی سعادتوں کا ضامن ایک جامع دین ہے جس کے اندر اصولِ عقاید، عبادات و مراسم، قوانین و معاملات اور دستورِ مملکت مختصراً پوری زندگی کا نظام ہے ..... اس کے برخلاف وہ شخص جس کے ماں باپ تو مسلمان ہوں اور وہ خود بھی مسلمانوں کے سے نام رکھے لیکن وہ اپنی عملی زندگی میں شترِ بے مہار ہو اور اپنے نفس کی پیروی میں غلط اصول و نظریات کو اپنائے تو اس کا اسلام سے کوئی علاقہ نہیں خواہ مردم شماری کے کاغذات میں اس کا نام مسلمان کی حیثیت سے سرِفہرست ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، نہ جس میں دو رائیں ممکن ہیں۔ بہرحال "اسلام" اور "مسلمان" کے اس عظیم فرق کو نظر انداز کر جانا ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا ارتکاب محمد علی جناح اور ان کے ماننے والوں نے کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص مسلم لیگ کے نظام میں جگہ پا گیا جو بس مسلمانوں کے سے نام رکھتا تھا۔ لیگ کا سالانہ چار آنے چندہ ادا کرتا تھا اور مطالبہ آزادی اور کانگریس دشمنی میں ان کا ہمنوا تھا۔ اس کے عقاید و اخلاق اور لوگوں سے معاملات میں اس کے رویہ سے کوئی بحث نہیں تھی۔ نتیجتہً مسلم لیگ میں بھانت بھانت کے لوگ جمع ہو گئے۔ (۱) انگریزی استعمار کے آلۂ کار۔ (۲) روسی اشتراکیت کے پرستار۔ (۳) کمالی تقریخ کے علمبردار، نسلی قومیت کے مبلغ، جغرافی وطنیت کے حامی۔ [۱۱]

یورپی استعمار سے عربوں کی نفرت

پاکستان کے قیام کے لئے شبانہ روز جدوجہد کرنے والوں کے جو صفات مولانا نے گنائے ہیں ان میں سے بالخصوص وہ جن پر ہم نے نمبر لگا دیئے ہیں عربوں کے دل میں پاکستان کے خلاف جذباتِ نفرت پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔ خاص کر یورپی استعمار کا آلۂ کار ہونا تو ان کے نزدیک گالی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بس ایک دفعہ انہیں کسی طرح یہ یقین دلا دیجئے کہ فلاں شخص یا جماعت یا ملک یورپی استعمار کا آلۂ کار ہے تو ان کا دل اس کی طرف سے کبھی صاف نہیں ہو سکتا۔ اُن دنوں اور اب بھی عربوں کا ایک عام اور ہر دلعزیز نعرہ یہ ہے۔

لَا یَجْتَمِعُ الاسلام والمیل الی الاستعمار الاوربی فی قلب واحد۔

اسلام اور یورپی استعمار کی طرف جھکاؤ کسی ایک دل میں کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔"

ہندوستانی پروپیگنڈے کو تقویت

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ بھارت، عربی ممالک کو پاکستان کی طرف سے متنفر کرنے

---

[۱۱] ماہنامہ چراغِ راہ مسعود علم نمبر۔ صفحہ ۱۶۱

کے لئے جو زہر آلود پراپیگنڈہ کر رہا تھا، جماعتِ اسلامی کے اس "جہادِ عظیم" نے اسے کس قدر تقویت پہنچائی ہوگی۔
ذرا اور آگے چلئے۔ اور تاریخ الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند و الباکستان میں تحریکِ پاکستان کے متعلق آخری پیراگراف ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں۔

اس مسلم قومیت کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ مسلم لیگ سے منسلک نوجوان طبقہ میں کمالی نظریات یعنی تفریخ، الحاد اور زندقہ کے تصورات پرورش پانے لگے۔ اس فتنہ کو ہوا دینے والے مسلم لیگ کے اکابر اور لیگی صحافت کا یہ سوچا سمجھا رویہ تھا کہ وہ علمائے اسلام پر طعن کرتے تھے اور علمبردارانِ دین کا مذاق اڑاتے تھے، اسلامی شعائر ان کے تمسخر و استہزاء کا ہدف بنے رہتے تھے اور اسلام کے اوامر و نواہی کا انہیں کوئی پاس و لحاظ نہ تھا۔ یہ گروہ حالات کے بدلنے کے باوجود ابھی تک موجود ہے۔[۱۳]

(ضمناً قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ آج جماعتِ اسلامی اُسی طبقے کے ساتھ مل کر سیاسی مقاصد حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہے اور اُسی لیگی صحافت کو علمبردار اور حق پرست قرار دے رہی ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے اس کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔)

خیال ہے کہ یہ عربی کتاب پاکستان بننے کے پورے پانچ سال بعد مکمل ہوئی۔ اُس وقت پاکستان کیا، ساری دنیا، "محسنِ پاکستان کو قائدِ اعظم کے نام سے پکارتی تھی.... یہاں تک کہ جانے سب سے بڑے دشمن 'ہندوستان' تک کے لیڈر بھی اس کا یہی نام لیتے تھے۔ لیکن ان حضرات کی اس پوری کتاب کو پڑھ جائیے، برصغیر کے مسلمانوں کے اس محسن کو ایک دفعہ بھی اس مشہور نام سے پکارنا گوارا نہیں فرمایا گیا۔

یہ کچھ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد تحریر فرمایا جبکہ یہ خود ہندو مظالم کا شکار ہو کر پاکستان میں پناہ لے چکے تھے اور ہندو کے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے مصر کے اخبار 'الفتح' میں تقریباً اسی موضوع پر ان کی جو کتاب محاضر مسلمی الھند و غابرھم چھپتی رہی تھی، اس میں کیا کچھ زہر نہیں اگلا گیا ہوگا۔ یہ کتاب ہمیں تو نہیں مل سکی لیکن مولانا مسعود عالم (مرحوم) کے ایک دیرینہ دوست، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک مقام پر اس کا حوالہ دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب اور جس کے ہم اقتباسات نقل کر چکے ہیں، کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔ وہ مقام ملاحظہ ہو۔

وہ بھی (یعنی مولانا مسعود عالم (مرحوم)) اپنی تحریروں میں ہمیشہ "اسلام" اور "مسلمانوں" کے درمیان امتیاز قائم رکھتے تھے اور دونوں لفظوں کے استعمال میں محتاط تھے۔ ان کا قلم بھی اسلام کی

---

[۱۳] ماہنامہ چراغِ راہ مسعود عالم نمبر صفحہ ۱۶۲

تاریخ نگاری میں یا اسلامی دعوتوں اور تحریکوں لہٰذا اصلاحی کوششوں کا جائزہ لینے میں مسلمان بادشاہوں کے غیر اسلامی افعال اور غلط نمائندگی پر سخت تنقید کرتا رہا ہے۔[13]

عرب اہل علم کا تاثر

یہ تھیں وہ تحریریں جو ان حضرات نے بڑی کاوشوں سے عربوں تک پہنچائی تھیں۔ اب عربوں نے اس سے کیا تاثر لیا' اسے بھی ملاحظہ فرمالیں۔ میرے خیال میں اس بارے میں محمد محمود الصراف ایڈیٹر الاخوۃ الاسلامیۃ بغداد کی مندرجہ ذیل تصریح اس کی صحیح نمائندگی کرتی ہے۔ مولانا کی وفات پر انہوں نے جو پیغام چراغ راہ کے "مسعود عالم نمبر" کے لئے ارسال فرمایا' اس میں فرماتے ہیں۔

> وہ مملکت پاکستان اور وہاں کے باشندوں کے بالعموم اور وہاں کی تحریک اسلامی کے بالخصوص صحیح نمائندہ ترجمان تھے۔ اس لئے ہمیں ان سے پاکستان کے اور وہاں کی جماعتوں کے وہ حالات معلوم ہوئے جن سے بلاد عرب بالکل ناواقف تھے۔[14]

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے تعلقات

دنیائے عرب کے عام اہل علم تو کجا' وہاں کی بڑی بڑی نامور علمی ہستیاں بھی ان کی تحریروں کو سند سمجھتی تھیں۔ انہی میں سے ایک شخصیت' ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (مرحوم) کی تھی۔ مولانا مسعود عالم نے ان سے سعودی عرب میں (جبکہ وہ وہاں حکومت مصر کے سفیر تھے) اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور ان کے اعلیٰ علمی رتبے سے بھی ہمیں آگاہ کیا ہے۔[15] مولانا کی کتاب "حاضر مسلمی الھند وغابرھم" جو مصر کے اخبار الفتح میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔ اب اس کے ایڈیٹر لسان الدین الخطیب اسے چوری چھپے شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس کا انہوں نے ڈاکٹر عزام (مرحوم) سے ذکر کیا تو انہوں نے (بقول ان کے) اس کتاب کے چھپوانے اور اس پر اپنی طرف سے مقدمہ لکھنے کا وعدہ کیا۔ لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر عبدالوہاب موصوف پاکستان میں حکومت مصر کے سفیر رہ چکے تھے۔ اس طرح انہیں یہاں کے حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ علاوہ بریں' جیسا کہ قارئین طلوع اسلام کو معلوم ہے' ڈاکٹر عزام (مرحوم) علامہ اقبال کے شیدائی تھے اور ان کے کلام کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے کے بے حد متمنی۔ انہیں معلوم ہوا کہ پاکستان میں ایک ہی شخصیت ہے جو اس باب میں ان کی راہ نمائی کر سکتی ہے اور وہ ہیں پرویز صاحب۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے ان سے راہ و رسم پیدا کی جو اس حد تک بڑھی کہ وہ جب تک پاکستان میں رہے پرویز صاحب سے' درس اقبال لیتے رہے۔ قصر سفارت میں' مجلس قلندران اقبال' کی ہفتہ وار نشستوں کی یاد آج بھی جاننے والوں کے لئے وجہ نشاط روح بنتی ہے۔ سفیر صاحب' پرویز صاحب کو "الشیخ" کہہ کر پکارتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے "ضرب کلیم" کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں انہیں اسی لقب سے یاد فرمایا ہے۔ پرویز صاحب' اقبال

[13] ماہنامہ چراغ راہ مسعود عالم نمبر صفحہ ۵۳ [14] ایضاً۔ صفحہ ۱۷ [15] دیار عرب میں چند ماہ۔ صفحہ ۳۶۹

کے شیدائی ہوئے کیساتھ، تحریکِ پاکستان کے نہایت پُرجوش مبلغ تھے ۔ یہ تھا وہ ذریعہ جس سے سفیر صاحب کو تحریکِ پاکستان کی حقیقت اور اس کے مقاصدِ عالیہ سے صحیح صحیح آگاہی ہوئی ۔ بنابریں، ہم سمجھتے ہیں کہ جب سفیر صاحب نے ندوی صاحب کی مذکورہ بالا کتاب کو بامعان دیکھا ہوگا تو اسے شائع کرنے یا اس پر مقدمہ لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر عزام (مرحوم) مصر میں، پاکستانی آئیڈیالوجی کے صحیح معنوں میں سفیر بن سکتے تھے لیکن بدقسمتی سے انہیں موت نے مہلت نہ دی اور وہ عرب میں اپنے زمانہ سفارت کے دوران وفات پا گئے۔ علاوہ بریں، بدقسمتی سے انہیں دنوں ایک اور ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا۔ یعنی نہر سویز پر اسرائیل، فرانس اور برطانیہ نے مل کر حملہ کر دیا۔ اس نازک صورت حالات میں ہماری اُس وقت کی حکومت نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس نے ہندوستان کے پراپیگنڈے کو (جسے جماعتِ اسلامی کی تحریروں نے پہلے ہی سے تقویت پہنچا رکھی تھی) اور زیادہ مؤثر بنا دیا۔

اہلِ عراق کی پاکستان سے محبّت

مختلف عرب ممالک کے حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عراق پر جماعتِ اسلامی کے مسموم پراپیگنڈے کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دوسرے عرب ممالک کی نسبت عراق ہم سے قریب ہے اور دونوں طرف سے لوگ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہاں مولانا مسعود عالم ندوی کے استاذ ڈاکٹر ہلالی رہتے تھے جو ہندوستان میں کافی عرصہ رہ چکنے کے بعد یہاں کے صحیح حالات سے اچھی طرح باخبر تھے۔ چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی کے دورۂ عراق کے دوران جب انہوں نے پاکستان کی تعریف کر دی، تو ہمارے مولانا اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکے۔ ان کے متعلق فرمایا۔

> وہ عراق سے بالکل مایوس اور پاکستان سے بہت خوش ہیں۔ دور کے ڈھول سہانے ہملئے ہاں کی کہاوت مشہور ہے۔ ہلالی صاحب نے ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ چھوڑا۔ اس دوران میں مسلم لیگ کی تحریک نے مسلمانوں کی عام مذہبی اور معاشرتی حالت کو جو نقصان پہنچایا ہے اسکا اندازہ وہ نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ جماعتِ اسلامی کا لٹریچر کام کر رہا تھا۔[۲۶]

قارئین اگر اس چھوٹے سے پیرے کو غور سے پڑھیں گے تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مولانا کی جو لمبی چوڑی عبارتیں تحریکِ پاکستان کے متعلق ہم نقل کر آئے ہیں یہ ان کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے۔ ایسے ایک دو پیراگراف اور بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں مولانا نے "اہلِ عراق" پر صحیح صورتِ حالات واضح کرنے کی پوری کوشش کی لیکن پھر بھی ان کے دل سے پاکستان کی محبت نہ نکل سکی۔ ایک علمی مجلس کا ذکر خود مولانا کی زبانی سنیئے۔

---

[۲۶] دیارِ عرب میں چند ماہ ص ۴۹

راقم نے عرض کیا۔ موجودہ اربابِ حکومت سب انگریزوں کے شاگرد ان کی تہذیب کے دلدادہ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔ قوم بین بین ہے۔ ایک جماعت دس برس سے دین کی طرف بلا رہی ہے۔ اور یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دستور ساز اسمبلی نے یہ قرار داد مقاصد پاس کی جس کا ذکر آپ سنتے ہیں ۔ ؎۱۷

عراق کے اسلام پسند نوجوانوں کے متعلق فرماتے ہیں ۔

"ان نوجوانوں کو پاکستان سے بڑی توقعات ہیں اور خصوصاً قرار داد مقاصد کے بعد۔ جب میں نے اپنی مشکلات بیان کیں تو انہیں حیرت ہوئی۔ پھر بھی ایک درد مند نے کہا۔ کم سے کم تمہارے لئے وہاں کام کی گنجائش تو ہے۔ ہمارے ہاں دین کے لئے کوئی گنجائش نہیں ؎۱۸

وہاں کی جمعیۃ الاداب الاسلامیۃ کے سیکرٹری سید عبدالہادی تھے۔ ایک ایسی ہی مجلس کی بات چیت ان کی زبانی سنئے :۔

یہ بیچارے خیال کرتے ہیں پاکستان اسلامی حکومت ہے اور اس کے وزراء و حکام سب اسلام کے عاشق اور احکام الٰہی کے پیرو ہیں میں نے صورتِ حال بیان کی۔ اس پر بعضوں نے کہا۔ بہرحال تمہارے ہاں توقع تو ہے اور ایک جماعت سرگرم عمل ہے۔ یہاں تو دین کا نام لینا قیامت ہے ؎۱۹

ان اقتباسات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مولانا نے جو اہل عراق پر صورتِ حال واضح کرنے کی کوشش فرمائی اس کا انہوں نے کوئی گہرا اثر نہ لیا۔ اسلئے اپنے سفرنامے کے اگلے صفحہ پر وہ اہل عرب کے بارے میں یہ تاثر دیتے ہیں۔

یوں نگاہ کی کمزوری اور قوتِ حافظہ کی خوبی عربوں کی قومی خصوصیت ہے۔ ؎۲۰

یہ تھیں وہ تفصیلات جن کا ہم نے قارئین سے وعدہ کیا تھا۔

---(۰)---

جماعتِ اسلامی کی اصول پرستی

آخر میں ہم جماعتِ اسلامی کی مزعومہ اصول پرستی کی ایک بین مثال سامنے لانا چاہتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے انتخاب صدر کے وقت ایک طرف امیدوار محمد ایوب خان تھے اور دوسری طرف محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ)۔ مودودی صاحب اس سے بہت پہلے یہ فیصلہ دے چکے تھے کہ اسلامی شریعت کی رُو سے عورت کا صدرِ مملکت بننا تو ایک طرف اس کے لئے ووٹ دینا بھی جائز نہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کے حق میں بھرپور کوشش کی۔ جب اسکے متعلق ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہمارے سامنے اس وقت تین صورتیں تھیں۔ یعنی۔

؎۱۷ دیارِ عرب میں چند ماہ۔ صفحہ ۹۵ ؎۱۸ ایضاً ص ۲۵ ؎۱۹ ایضاً ص ۲۷ ؎۲۰ ایضاً۔ ص ۲۸

(۱) ایک صورت یہ تھی کہ (جماعت) صدر ایوب صاحب کی حمایت کا اعلان کرتی اور اس کے سارے نتائج کی ذمہ داری خدا اور خلق کے سامنے اپنے سر لیتی [۲۱]

(۲) دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اس فیصلہ کن مرحلہ پر بالکل غیر متعلق تماشائی بن کر بیٹھ جاتی اور قوم کو سرے سے کوئی رہنمائی نہ دیتی۔ جو حضرات جماعت کو اس طرح کے مشورے دیتے ہیں انہیں شاید احساس نہیں ہے کہ یہ بھی آمریت کے بقا میں مددگار بننے کی ایک دوسری صورت ہوتی۔ [۲۲]

(۳) ان حالات میں جماعتِ اسلامی کے لئے دینی نقطہ نظر سے مناسب ترین صورت یہی باقی رہ گئی تھی کہ وہ ان لوگوں سے تعاون کرے جو آمریت کو ختم کرنے اور اس کی جگہ جمہوریت کو بحال کرنے کے لئے کوشاں ہیں [۲۳]

ان تینوں شکلوں پر پوری طرح غور و فکر کرنے کے بعد جماعت کے عمائد اس نتیجہ پر پہنچے کہ دینی اور ملی نقطہ نظر سے اس وقت جماعت کے لئے محترمہ فاطمہ جناح کی تائید کے سوا کوئی دوسرا جائز طریق کار نہیں ہے، کیونکہ پہلی دونوں صورتوں کے اختیار کرنے کے معنی عملاً فیلڈ مارشل صاحب کو کامیاب کرانے اور اس آمریت کے بقا میں ممد و معاون ہونے کے ہیں۔ [۲۴]

اس بحث کی روشنی میں اصول یہ بنا کہ اس نازک صورتِ حال میں اگر اپنے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے علیحدگی اختیار کی جاتی تو اس کا مطلب آمریت کے بقا میں ممد و معاون ہونا تھا۔

اب اس اصول کو برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کے سب سے بڑے فیصلہ کن اور نازک مرحلہ پر چسپاں کیجئے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، یہ نازک اور فیصلہ کن مرحلہ وہ انتخابات تھے جن کی بنیاد پر پاکستان کا قیام وجود میں آنے والا تھا۔ اس وقت بھی جماعتِ اسلامی کے سامنے یہی تین صورتیں تھیں جسے ہم جماعتِ اسلامی کے ہی رسالہ ترجمان القرآن سے حوالہ نمبر ۳ اور ۴ پر نقل کر آئے ہیں۔ وہ تین صورتیں یہ تھیں۔

(۱) کانگریس کی حمایت جو پورے ہندوستان پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔

(۲) تحریکِ پاکستان جو مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل پاکستان کا قیام چاہتی تھی۔

(۳) آزادی کی ان دونوں تحریکوں سے علیحدہ رہا جائے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ برطانوی سامراج کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

جماعتِ اسلامی نے اوپر کی دونوں تحریکوں سے علیحدگی رکھتے ہوئے کسی کو بھی ووٹ نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ جس کا لازمی نتیجہ تیسری صورت، یعنی برطانوی سامراج کے بقا میں ممد و معاون ہونا تھا۔ ان حالات میں آپ خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ غیر منقسم ہندوستان میں، یورپی استعمار کی حامی جماعتِ اسلامی تھی یا مسلم لیگ؟ یہ جماعت

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

---

[۲۱] ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۵۸ ۔ [۲۲] ایضاً صفحہ ۳۵۹ ۔ [۲۳] ، [۲۴] ۔ ایضاً

اِسلام کا معاشی نصب العین

(مودودی صاحب کے تصوّر کے مطابق)

یہ حقیقت اب کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ مودودی صاحب مغرب کے نظامِ سرمایہ داری کے پُرجوش حامی ہیں۔ لیکن چونکہ اس دور میں سرمایہ داری کی حمایت کرنے والوں کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھا جاتا اس لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ اعلان کریں گے کہ اسلام (یعنی ان کے تصور کا اسلام) سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں کا مخالف ہے اور اپنا ایک خاص معاشی نظام رکھتا ہے۔ اس کے بعد جو معاشی نظام پیش کرینگے وہ عین نظامِ سرمایہ داری ہوگا۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب کا ایک خصوصی مقالہ (عنوان بالا کے تحت) معاصر ایشیا کی ۱۷ جنوری ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے پہلے (تمہیداً) کہا ہے کہ اسلام کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے نظام کے بنیادی اصول دیتا ہے اور یہ ہم پر چھوڑ دیتا ہے کہ ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق (ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے) نظام خود مرتب کرلیں۔ (ان کے مقالہ کا یہ اقتباس ہم نے طلوعِ اسلام کی اشاعتِ حاضرہ میں 'حقائق و عبر' کے عنوان کے تابع نقل کیا ہے۔ آپ اسے وہاں دیکھ لیں)۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حسب ذیل اصول بیان کئے ہیں۔ یعنی

(۱) "اولین چیز جو معیشت کے معاملہ میں اسلام کے پیشِ نظر ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی آزادی کو محفوظ رکھا جائے اور صرف اس حد تک اس پر پابندی عاید کی جائے جس حد تک نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ناگزیر ہے۔"

(۲) "دوسری بات یہ ہے کہ اسلام انسان کی اخلاقی نشوونما کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ہر معاشرہ کے اجتماعی نظام میں فرد کو اختیارِ حسنِ عمل کے لئے زیادہ

سے زیادہ مواقع حاصل رہیں تاکہ فیاضی، ہمدردی، احسان اور دوسرے اخلاقی فضائل روبہ عمل آسکیں"۔ اور

(۳) "تیسری بات یہ ہے کہ اسلام انسانی وحدت و اخوت کا علمبردار اور تفرقہ و تصادم کا مخالف ہے۔ اس لئے وہ انسانی معاشرہ کو طبقات میں تقسیم نہیں کرتا اور فطری طور پر جو طبقات موجود ہیں ان کو طبقاتی نزاع کے بجائے ہمدردی اور تعاون کی راہ دکھاتا ہے"۔

پہلے اصول سے مودودی صاحب یہ نتیجہ مستنبط فرماتے ہیں کہ اگر ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت کے بجائے ملت کی اجتماعی تحویل میں رہیں تو فرد کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔

اس سے ــــ

"آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو آدمی اپنی معاش کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کا دستنگر ہو وہ اگر اپنی کوئی آزادانہ رائے رکھتا بھی ہو تو وہ اپنی اس رائے پر عمل کرنے میں آزاد نہیں ہو سکتا"۔

لہٰذا ــــ

"اسلام چند حدود کے اندر شخصی ملکیت کا اثبات کرتا ہے اور شخصی ملکیت کے معاملہ میں وہ ذرائع پیداوار (MEANS OF PRODUCTION) اور اشیائے صرف (CONSUMER GOODS) کے درمیان فرق نہیں کرتا۔ وہ انسان کو ملکیت کا عام حق دیتا ہے ..... اگر شخصی ملکیت کا حق چھین لیا جائے اور تمام وسائل معاش پر اجتماعی ملکیت قائم کر دی جائے تو انفرادی آزادی لازماً ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے بعد تو معاشرے کے تمام افراد اس ادارے کے ملازم بن جاتے ہیں جس کے ہاتھ میں پوری مملکت کے وسائل معاش کا کنٹرول ہو"۔

یہ تو رہا وسائل پیداوار کا سوال۔ جہاں تک دولت کمانے کا تعلق ہے، مودودی صاحب فرماتے ہیں۔

ایک شخص حلال ذرائع سے اپنی روزی کمانے میں پوری طرح آزاد ہے جس طرح چاہے کمائے۔ اس کی کمائی ہوئی دولت کا وہ جائز مالک ہے کوئی اس کی جائز ملکیت کو محدود کرنے یا اس سے چھین لینے کا حق نہیں رکھتا ..... ایک شخص حلال ذرائع سے کروڑ پتی بن سکتا ہے تو اسلام اس کے راستے میں حائل نہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ اس دولت میں سے انسان اپنی ضروریات کے مطابق خرچ کرنے کے بعد، بقایا کو روک کر نہ رکھے بلکہ اسے گردش میں لاتا رہے۔ یعنی

اسے مزید دولت کمانے میں استعمال کیا جائے۔

اس طرح مزید دولت کمانے کے جائز اور حلال طریقوں میں مزارعت اور مضاربت دونوں شامل ہیں۔

"مزارعت یہ ہے کہ زمین ایک شخص کی ہے اور اس پر کاشت دوسرا شخص کرتا ہے اور یہ دونوں اس کے مفاد میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ مضاربت یہ ہے کہ ایک آدمی کا روپیہ ہے اور دوسرا اس روپے سے کاروبار کرتا ہے اور یہ دونوں اس کے منافع میں حصہ دار ہیں۔"

ہم ملک کے ماہرین اقتصادیات سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جس معاشی نظام کی مودودی صاحب نے نشاندہی کی ہے وہ اگر نظام سرمایہ داری نہیں تو پھر نظام سرمایہ داری کسے کہتے ہیں؟

(۰)

اب ذرا دیکھئے اس "مصلحت" کو جس کے پیش نظر اسلام (بقول مودودی صاحب) ذرائع پیداوار کو اجتماعی تحویل کے بجائے شخصی ملکیت میں دینا ضروری قرار دیتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) وہ فرماتے ہیں۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو آدمی اپنی معاش کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کا دست نگر ہو وہ اگر اپنی کوئی آزادانہ رائے رکھتا بھی ہو تو وہ اپنی اس رائے پر عمل کرنے میں آزاد نہیں ہو سکتا۔

اب ان صاحب کو کوئی کیسے بتائے کہ اسلام ذرائع پیداوار کو اسی لئے شخصی ملکیت میں نہیں دیتا کہ اس طرح "ایک شخص اپنی معاش کے معاملہ میں دوسرے شخص کا دست نگر ہو جاتا ہے" اور یہ چیز وجہ تذلیل انسانیت ہے۔ ذرائع پیداوار اگر امت کی اجتماعی تحویل میں رہیں تو معاش کے معاملہ میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا دست نگر نہیں رہتا۔ آپ مودودی صاحب کی دلیل کو سامنے رکھتے ہوئے غور فرمائیے کہ اگر گاؤں کی زمین ایک زمیندار کی شخصی ملکیت ہو اور گاؤں کے رہنے والے کسان اس کے مزارع ہوں، یا کارخانہ کا مالک ایک فرد ہو اور اس میں سینکڑوں مزدور اجرت پر کام کرتے ہوں تو اس صورت میں ان مزارعوں اور مزدوروں کی آزادی برقرار رہتی ہے۔ لیکن اگر اس زمین یا کارخانہ کو (مملکت کے انتظام کے تحت) ان کسانوں یا مزدوروں کی مشترکہ تحویل میں دے دیا جائے تو اس سے ان کی آزادی سلب ہو جاتی ہے! ۔۔۔ کہئے! اس منطق کا کیا جواب ہے؟ ان سے پوچھئے، کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے افراد امت کو معاشی فکر سے آزاد کرنے کے لئے، ان کے وظائف مقرر کر دیئے تھے تو کیا اس سے ان افراد کی آزادی سلب ہو گئی تھی؟

(۰)

اب آیئے مودودی صاحب کے پیش کردہ دوسرے اصول کی طرف۔ اس کی تشریح میں وہ فرماتے ہیں۔

اس معاملہ میں وہ (یعنی اسلام) سب سے بڑھ کر جس چیز کو اہمیت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی داخلی اصلاح کی جائے۔ اس کے ذوق کو بدلا جائے اور اس کے سوچنے کے انداز کو تبدیل کیا جائے۔ اور اس کے اندر ایک مضبوط اخلاقی حس (MORAL SENSE) پیدا کی جائے جس سے وہ خود انصاف پر قائم رہے۔ ان ساری تدبیروں سے جب کام نہ چلے تو مسلمانوں کے معاشرے میں اتنی جان ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے اجتماعی دباؤ سے آدمی کو حدود کا پابند رکھے۔ اس سے بھی جب کام نہ چلے تب اسلام قانون کی طاقت کا استعمال کرتا ہے تاکہ بزورِ انصاف قائم جائے اسلامی نقطۂ نظر سے ہر وہ اجتماعی نظام غلط ہے جو انصاف کے قیام کے لئے صرف قانون کی طاقت پر انحصار کرے اور انسان کو اس طرح باندھ کر رکھ دے کہ وہ اپنے اختیار سے بھلائی کرنے پر قادر نہ رہے۔

معلوم نہیں اس سے مودودی صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنا نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے عقل و شعور اور علم و بصیرت کے ساتھ غور و فکر کریں۔ جو شخص اس کی صداقت کا قائل ہو جائے وہ اسے دل اور دماغ کی کامل رضامندی کے ساتھ قبول کر کے اسلامی سوسائٹی کا ممبر بن جائے۔ اس ممبر شپ (رکنیت) کے لئے اسے ایک معاہدہ کرنا ہوتا ہے جو قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (۹/۱۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لئے ہیں جنت کے عوض۔

اب ظاہر ہے کہ جو شخص اس طرح بطیبِ خاطر اپنی جان اور مال بیچ دیتا ہے، ان چیزوں پر اس کی ذاتی ملکیت کہاں رہ جاتی ہے، اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیزیں اس سے اجتماعی دباؤ یا قانون کے زور پر لی جاتی ہیں۔ کیا اس سے بڑا اختیاری حسنِ عمل اور بھی کوئی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنا سب کچھ بطیبِ خاطر دوسرے کے ہاتھوں بیچ دے؟ مومن جب تک اس (اسلامی) سوسائٹی کا ممبر رہتا ہے، اس سوسائٹی کے ہر تقاضے کو بطیبِ خاطر پورا کرتا ہے ــــ اور اگر (بفرضِ محال) وہ کسی وقت اس پر رضامند نہیں رہتا تو اس کے لئے راستہ کھلا ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے باہر نکل جائے۔ لہٰذا اسلام میں کسی سے جبراً کچھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک شخص جب اسلام لاتا ہے تو اسے اس کا علم ہوتا ہے کہ ذرائع پیداوار

میں سے اس کی ذاتی ملکیت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور جو کچھ وہ کمائیگا اس میں سے بقدر اس کی ضروریات کے اس کے مصرف میں آئے گا۔ باقی سب نوعِ انسان کی بہبود کے لئے کھلا رہے گا۔ حتےٰ کہ عند الضرورت، وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دے گا۔ ($\frac{59}{9}$)

یہ تو ہے قرآن کی رُو سے اسلامی نظامِ معیشت کا بنیادی اصول۔ لیکن اگر ہم مودودی صاحب کے پیش کردہ اصول ہی کو لیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ عند الضرورت قانون کی طاقت استعمال کرنے، اور بزورِ انصاف قائم کرنے کو خلافِ اسلام نہیں سمجھتے تو اگر اسلامی مملکت، معاشی انصاف قائم کرنے کے لئے قانون کی طاقت سے ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہے تو اس کا یہ عمل کس طرح خلافِ اسلام قرار پا سکتا ہے۔ خود مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی مملکت کا جو تصور ہے اسے انہی کے الفاظ میں دیکھئے۔ وہ ("اسلام کا نظریۂ سیاسی" میں) لکھتے ہیں:-

> اس نوعیت کا اسٹیٹ (یعنی اسلامی اسٹیٹ) ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ اگر یہ اسٹیٹ، ذرائع پیداوار کو کسی کی پرائیویٹ پراپرٹی نہیں بننے دیتا تو (خود مودودی صاحب کے تصور کے مطابق) اس کا یہ عمل کس طرح خلافِ اسلام قرار پائے گا؟ مودودی صاحب کے تصور کی اسلامی اسٹیٹ تو اس قدر فاشستی ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے تو اسے موت کی سزا دیدی جاتی ہے!

اب مودودی صاحب کے پیش کردہ تیسرے اصول کی طرف آیئے۔ یعنی اس اصول کی طرف کہ اسلام، انسانی معاشرہ کو طبقات میں تقسیم تو نہیں کرتا۔ لیکن جو طبقات فطری طور پر موجود ہیں، ان کو طبقاتی تزاع کے بجائے ہمدردی اور تعاون کی راہ دکھاتا ہے۔ اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے، مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> اسلامی نظامِ معیشت کا ایک اور اصول یہ ہے کہ وہ دولت کی مساوی (EQUAL) تقسیم

کے بجائے منصفانہ (EQUITABLE) تقسیم چاہتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ہرگز یہ نہیں کہ تمام انسانوں کے درمیان ذرائع زندگی کو برابر تقسیم کیا جائے۔ قرآن مجید کو جو شخص بھی پڑھے گا اسکو صاف معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی اس کائنات میں کہیں بھی مساوی تقسیم نہیں پائی جاتی۔ مساوی تقسیم ہے ہی غیر فطری۔

ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ دنیا کا وہ کونسا معاشی نظام ہے جو دولت کی مساوی تقسیم کا اصول پیش کرتا ہے۔ مساوی تقسیم کا تصور تو کمیونزم تک کی انتہائی شکل میں بھی نہیں۔ جہاں تک ہمیں علوم ہے پاکستان میں بھی کسی نے مساوی تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا۔ خود طلوعِ اسلام بھی جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے وہ اسے نظامِ ربوبیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کریم کا آغاز خدا کی صفتِ ربّ العالمین سے ہوتا ہے۔ (الحمد للّٰہ ربّ العالمین)۔ ربّ کے معنی ہیں وہ جو کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے نشو و نما دیتا ہوا بتدریج اس کی تکمیل تک لے جائے۔ اسی کو نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ خدا کا یہی نظام خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے اور وہ اسی نظام کو انسانی دنیا میں رائج کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں ہر فرد کو اس کی طبیعی ضروریات پورا کرنے۔ اور اس کی مضمر صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کے سامان میسر ہوں۔ اسی لئے اس نے ذرائع زندگی کے متعلق کہا ہے کہ وہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ رہنے چاہئیں (۴۱/۱۰)۔ یعنی ہر ضرورت مند کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب وہ دلیل لاتے ہیں جو نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں اور بنیاد پرستوں کا عُروۃ الوثقیٰ سمجھی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

> مساوی تقسیم ہے ہی غیر فطری۔ کیا تمام انسانوں کو یکساں صحت دی گئی ہے؟ کیا تمام انسانوں کو یکساں ذہانت دی گئی ہے؟ کیا تمام انسانوں کا حافظہ یکساں ہے؟ کیا تمام انسان حسن میں، طاقت میں، قابلیت میں برابر ہیں؟ کیا تمام انسان ایک ہی طرح کے حالاتِ پیدائش میں آنکھیں کھولتے ہیں۔ اور دنیا میں کام کرنے کے لئے بھی سب کو ایک ہی طرح کے حالات ملتے ہیں۔ اگر ان ساری چیزوں میں مساوات نہیں تو ذرائع پیداوار اور تقسیم دولت میں مساوات کے کیا معنی۔ یہ عملاً ممکن نہیں ہے۔

بالکل درست ہے: ان حالات میں دولت کی مساوی تقسیم انصاف نہیں بلکہ ظلم ہوتا۔ اور اس کا عملی مظاہرہ ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔ جو بچہ کمزور پیدا ہوتا ہے اسے صحت مند بچوں کے مقابلہ میں زیادہ خوراک دی جاتی ہے جس بچہ کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اسے مقویاتِ دماغ کھلانے کے علاوہ، اس کے لئے ٹیوشن کا خصوصی انتظام

کیا جاتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔ یہی کیفیت نظامِ ربوبیت کی رُو سے اسلامی معاشرہ میں ہوتی ہے۔ جو لوگ کسی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں انہیں خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور ان پر زیادہ خرچ کیا جاتا ہے، تاکہ ان کی کمی پوری ہو جائے۔ (اسے قرآنی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں۔ یعنی کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا)۔ بنابریں اس معاشرہ میں دولت کی تقسیم مساوی نہیں، منصفانہ ہوتی ہے ــــ یعنی ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق دیا جاتا ہے۔

لیکن مودودی صاحب تو (ہر سرمایہ دار کی طرح) اس سے ایک اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ جب مختلف لوگوں میں کمانے کی استعداد مختلف ہے تو ہر ایک کو دولت میں مساوی کس طرح کر دیا جائے۔؟ جسے کمانے کی زیادہ استعداد حاصل ہے اس کے پاس زیادہ دولت ہونی چاہیئے۔ جسے کم استعداد حاصل ہے اسے غریب رہنا چاہیئے ــ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہ دلیل قارون نے پیش کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جو دولت میرے پاس ہے اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸) یہ سب میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اس میں مداخلت کرے۔ یہی دلیل مودودی صاحب پیش فرماتے ہیں کہ جو اپنی ہنرمندی سے زیادہ کماتا ہے وہ اپنی کمائی کا واحد مالک ہے۔ جو کم کماتا ہے اسے اپنی "قسمت" پر شاکر رہنا چاہیئے۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مودودی صاحب نے مختلف افراد میں جس جسمانی اور ذہنی تفاوت اور حالات و مواقع کے اختلاف کا ذکر کیا ہے، ان میں کتنے ہیں جو خود غلط معاشرہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ پہلے مختلف اقوام میں دیکھئے۔ جو قوم اپنے تمدنی اور معاشی حالات بہتر بنا لیتی ہے اس کے افراد، ان اقوام کے مقابلہ میں جن کے یہ حالات خراب ہوتے ہیں، کہیں زیادہ بہتر صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر ایک قوم کے مختلف طبقات میں دیکھئے تو ان کے تمدنی اور معاشی حالات کے مطابق ان کے بچوں کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہی کیفیت اکتساب رزق کے مواقع کی ہے۔ امراء اور رؤساء کے بچوں کو پیدائش کے ساتھ ہی وہ مواقع حاصل ہوتے ہیں جن کا غریب خاندان کے بچے، اعلیٰ قابلیت کے باوجود، خواب تک نہیں دیکھ سکتے۔

ان حقائق کی موجودگی میں مودودی صاحب کی دلیل کا تجزیہ کیجئے۔ یعنی معاشرہ کا باطل نظام، مختلف افراد میں جسمانی، ذہنی اور حالات کا تفاوت پیدا کرتا ہے اور آپ اسے فطرت (یعنی خدا) کیطرف منسوب کر دیتے ہیں۔ پھر جو افراد اس طرح دوسروں سے پیچھے رہ جائے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں، بجائے اسکے کہ انہیں آگے بڑھانے کی کوشش کی جائے، آپ کہتے ہیں کہ فطرت کا منشاء ہی یہی ہے کہ وہ پیچھے رہیں، اس لئے انہیں

یہ وعظ سناتے رہنا چاہیئے کہ خدا کی مرضی ہی یہ ہے کہ تم لوگ غریب رہو اور وہ لوگ امیر رہیں۔ یہ خدا کی تقسیم ہے جس کے خلاف لب پر حرفِ شکایت لانا تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف گرانی نہیں گذرنی چاہیئے۔ بندہ کو ہر حال میں خدا کے فیصلوں پر شاکر و صابر رہنا چاہیئے ـــــ یہی ہے باطل مذہب کا وہ تصور جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ قرآن مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی استعداد میں تفاوت کو تسلیم کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ ان حالات میں کرنا کیا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ـــــ انسانوں میں اکتسابِ رزق کے معاملہ میں ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ۔ لیکن جن لوگوں میں یہ استعداد زیادہ ہوتی ہے ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سارے کا سارا خود ہی سمیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ یہ ساری دولت ان کی انفرادی جد و جہد کا نتیجہ نہیں۔ اس میں بیشتر حصہ ان کا ہے جو ان کے ساتھ ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں۔ یہ زائد رزق درحقیقت ان کا کمایا ہوا ہے۔ اس لئے انہیں چاہیئے کہ ان کا رزق ان کی طرف لوٹا دیں۔ لیکن یہ ایسا نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ واہ! اس طرح تو سب برابر ہو جائینگے۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ جس قابلیت کے بل بوتے پر یہ زیادہ کماتے ہیں وہ ان کی زرخرید نہیں ہوتی۔ یہ انہیں فطرت کی طرف سے مفت ملی تھی۔ اسے اپنی ذاتی ہنرمندی قرار دینا درحقیقت نعمتِ خداوندی سے انکار کرنا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم اس حقیقت کو کیسے دلنشیں انداز میں بیان کرتا ہے کہ جسے کمانے کی استعداد کہا جاتا ہے وہ مختلف عوامل سے مرتب ہوتی ہے۔ یعنی

(۱) ذہنی استعداد ـــــ یہ نہ کسی فرد کی زرخرید ہوتی ہے اور نہ ہی اسکے کسب و ہنر کی پیدا کردہ۔ یہ فردِ متعلقہ کو وہبی طور پر (مفت) ملتی ہے۔

(۲) تعلیم و تربیت ـــــ یہ اس ماحول کی طرف سے ملتی ہے جس میں ایک فرد پرورش پاتا ہے۔ اس لئے یہ بھی ایک فرد کی ذاتی طور پر پیدا کردہ نہیں ہوتی۔

(۳) کسبِ دولت کے مواقع ـــــ یہ معاشرہ کے مہیا کردہ ہوتے ہیں۔

(۴) رفقائے کار کا تعاون ـــــ یہ پیدائشِ دولت میں سب شریک ہوتے ہیں ـــــ اور

(۵) محنت ـــــ بس یہ چیز ایک فرد کی اپنی ذاتی ہوتی ہے اور وہ اسی کے معاوضہ کا درحقیقت حقدار ہوتا ہے۔ جو شخص ان جملہ عوامل کی پیدا کردہ دولت کو اپنی ذاتی، واحد ملکیت سمجھتا ہے، وہ اس حقیقت سے انکار کرتا ہے کہ یہ عوامل اس کے ذاتی اور انفرادی طور پر پیدا کردہ نہیں تھے۔ صحیح معاشرہ میں یہ زائد دولت ان عوامل کی طرف لوٹا دی جاتی ہے۔

یہ ہے قرآن کا نظامِ معیشت۔

لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جو لوگ معاشرہ میں محتاج ہوں، ان کی مدد خیرات کے طور پر کی جائے۔ اُن کے اپنے الفاظ ہیں۔

قرآن ہر کھاتے پیتے آدمی پر ذمہ داری ڈالتا ہے کہ وہ اپنی حد وسع تک ہر اس شخص کی مدد کرے جو مدد مانگے یا مدد کا محتاج ہو۔

آپ اس نظام پر غور کیجئے جس میں ایک محتاج، دولت مند کے پاس خیرات مانگنے کے لئے جائے اور وہ یوں اس کی مدد کرے۔ مودودی صاحب نے اپنے پہلے اصول کے تابع لکھا تھا کہ

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو آدمی اپنی معاش کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کا دست نگر ہو وہ اگر اپنی کوئی آزاد رائے رکھتا بھی ہو، تو وہ اپنی اس رائے پر عمل کرنے میں آزاد نہیں ہو سکتا۔

آپ سوچئے کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کے پاس خیرات مانگنے کے لئے جائے، کیا وہ اپنی آزاد رائے پر عمل کرنے کے قابل رہ سکتا ہے؟

پھر اس نظامِ خیرات کے دوسرے پہلو پر بھی غور کیجئے۔ مودودی صاحب کے پیش کردہ تصور کے مطابق، امیر اور غریب، دولت مند اور محتاج کے یہ طبقات، فطرت، یعنی خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا پہلے ایک طبقہ کو محتاج بنا دیتا ہے اور دوسرے طبقہ کو دولت مند، پھر دولت مندوں سے کہتا ہے کہ جنہیں میں نے صاحبِ احتیاج بنایا ہے تم خیرات دے کر ان کی احتیاج رفع کرو۔ اور اس طرح ثواب حاصل کر کے جنت کے حقدار بن جاؤ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟

قرآن کہتا ہے کہ محتاج اور دولت مند طبقات تمہارے غلط نظام کے پیدا کردہ ہیں۔ دولت مند، دوسروں کا حق غصب کر کے، انہیں محتاج بناتے اور خود دولت مند بنتے ہیں۔ اس لئے دولت مندوں کے پاس جو زاید دولت ہے، وہ درحقیقت ان محتاجوں کا حق ہے جو انہوں نے غصب کر رکھا ہے۔ صحیح نظامِ معیشت، محتاجوں کے اس حق کو انہیں واپس دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ۔ وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ ان دولت مندوں کے مال میں ان کا، جنہیں محتاج و محروم بنا دیا گیا ہے، حق ہے جو انہیں، واپس ملنا چاہیئے۔ وہ ان سے جو کچھ لیتے ہیں خیرات کے طور پر نہیں لیتے۔ بطور اپنے حق کے (AS OF RIGHT) وصول کرتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا۔ کہ قرآن کریم اس مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے؟ خیرات نہیں، بلکہ غصب کردہ حقوق کی بازیابی۔ خیرات کے نظام کے متعلق قرآن کریم نے تاریخ کے ایک واقعہ سے ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ اس نے کہا

ہے کہ یہودیوں کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے مگر وہ بھائیوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔ پھر جب انہیں، دوسرے لوگ گرفتار کر کے لے جاتے، تو وہی اہل ثروت یہودی، چندہ اکٹھا کرتے، تاکہ ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیا جاتے اور اس طرح ثواب کما لیا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھئے کہ وہ جو تم نے انہیں پہلے گھروں سے نکال باہر کیا تھا، وہ تمہارے لئے کس طرح جائز تھا؟ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۔ (۲/۸۵)۔ ان کا اس طرح گھروں سے نکال دینا سخت جرم تھا۔ تم پہلے اس جرم کے مرتکب ہوتے ہو اور پھر خیرات کے چار پیسوں سے اپنے لئے ثواب خریدتے ہو؟ سوچو کہ یہ روش اور ذہنیت کس قدر فریب انگیز ہے۔

کچھ اسی قسم کا نقشہ ہے جو مودودی صاحب کا پیش کردہ معاشی نظام سامنے لاتا ہے۔ ہم اپنے باطل معاشی نظام سے پہلے ایک طبقہ کو محتاج بنا دیتے ہیں اور پھر ان لوگوں سے، جو ان کے حقوق دبا کر مالدار بن جاتے ہیں، وعظ کہتے ہیں کہ ان محتاجوں کی مدد کرو، خدا تمہیں جنت عطا کرے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ ان لوگوں کو محتاج بنا دینا کون سا ثواب کا کام تھا؟ تم پہلے انہیں خود ہی اس حالت تک پہنچا دیتے ہو اور پھر ان کی مدد کر کے اپنے آپ کو ثواب کا مستحق قرار دیتے ہو؟ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۔ (۲/۸۵)۔ جو قوم اس قسم کی روش اختیار کرے گی، اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کرے اور عاقبت میں سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو۔

یہ ہے نتیجہ اس نظام کا جسے مودودی صاحب اسلام کا معاشی نظام کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک، خیرات تو ایک طرف، زکوٰۃ بھی اُمت کی اجتماعی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہیں بلکہ بطور خیرات محتاجوں کی انفرادی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

> یہ زکوٰۃ سرے سے اس غرض کے لئے ہے ہی نہیں کہ ان اجتماعی ضروریات کو پورا کیا جائے جن سے متمتع ہونے میں آپ خود بھی شامل ہیں۔ بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص کی گئی ہے جو کسی نہ کسی طرح دولت کی تقسیم میں اپنا حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں۔ اور کسی وجہ سے مدد کے محتاج ہیں۔ خواہ عارضی طور پر یا مستقل طور پر۔

مودودی صاحب یہ کہہ کر کہ جو لوگ <u>کسی نہ کسی طرح</u> دولت کی تقسیم میں اپنا حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں اور <u>کسی وجہ سے</u> مدد کے محتاج ہیں،" حقیقت کو سامنے لانے سے اغماض برت رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے

کہ یہ نظامِ سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہے کہ لوگوں کا ایک طبقہ دولت کی تقسیم میں اپنا حصہ پانے سے محروم رہ جاتا ہے۔ سو بجائے اس کے کہ وہ اس حقیقت کو سامنے لاتے، وہ "کسی نہ کسی طرح" اور "کسی وجہ سے" کہہ کر نگاہوں کا رُخ سرمایہ داری کی طرف مُڑنے نہیں دینا چاہتے۔ یاد رکھئیے! صحیح قرآنی نظام میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ معاشرہ کی کچھ آبادی ہنگامی طور پر مدد کی محتاج ہو جائے ـــ مثلاً زلزلہ یا سیلاب وغیرہ کی وجہ سے۔ اس صورت میں بھی ان کی امداد معاشرہ کا اجتماعی فریضہ ہوگا۔ لیکن کوئی ایسا نظام جس میں آبادی کا ایک حصہ دولت کی تقسیم میں اپنا حصہ نہ پانے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج بن کر رہ جائے، اور دولت کو سمیٹ لینے والے طبقہ سے کہا جائے کہ وہ ان بیچاروں پر ترس کھا کر ان کی مدد کریں، کبھی اس خدا کا تجویز کردہ نظام نہیں ہو سکتا جس کی اولین صفت ربّ العالمینی ہے اور جو احترامِ آدمیت اور شرفِ انسانیت کو تمدنِ انسانی کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ کوئی ایسا نظام جس میں ایک فرد محض روٹی کے لئے دوسروں کے سامنے ذلّت کا ہاتھ پھیلائے، کبھی شرف و مجد کے مالک خدا کا نظام نہیں کہلا سکتا۔ خدا کا تجویز کردہ نظام یہ ہے کہ

> تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا، نظامِ معاشرہ کا فریضہ ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ذرائع پیداوار معاشرہ کی اجتماعی تحویل میں رہیں اور کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہے۔
>
> اسی قسم کے نظام کا قیام قرآن کا مطلوب و مقصود اور منتہیٰ و نصب العین ہے، اور یہی طلوعِ اسلام کی دعوت ہے۔

ـــــــ (پرویز) ـــــــ

ڈھاکہ میں بزمِ طلوعِ اسلام کا قیام

محترم محمد اکرم راٹھور صاحب (۱ ام نواب کٹرا۔ ڈھاکہ ۱) نے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے اپنے ہم فکر و ہم آہنگ احباب کی معیت میں ڈھاکہ میں بزمِ طلوعِ اسلام قائم کر لی ہے۔ ادارہ اس بزم کے قیام کی منظوری دیتے ہوئے محترم راٹھور صاحب اور آپ کے رفقائے بزم کے لئے دعاگو ہے کہ قرآن کریم کے پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں میں برکت اور استقامت عطا فرمائے ـــ مشرقی پاکستان کے احباب مذکورہ بالا پتہ پر رابطہ قائم کریں۔

ناظم

حقائق و عبر

۱۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

قارئین طلوعِ اسلام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ قانون سازی کے سلسلہ میں ہمارا مسلک کیا ہے۔ ہم شروع سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ بجز ان تفصیلات کے جنہیں قرآن کریم نے خود ہی اپنے اندر واضح کر دیا ہے، دین کے محکم اصول دیئے گئے ہیں جو مستقل حدود کا کام دیتے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانہ کی اُمت (یا یوں کہیئے کہ اسلامی مملکت) اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرتی ہے ۔ وہ حدود ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہیں لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے وضع کردہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ثبات اور تغیر کے حسین امتزاج سے اسلامی قوانین ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس مسلک کی مخالفت ہوتی ہے اور مخالفت بھی اس شدت کی کہ اس پر کفر کے فتوے صادر کر دیئے جاتے ہیں۔ اس مخالفت میں جماعتِ اسلامی دوسرے گروہوں سے پیچھے نہیں رہتی۔ لیکن اب دیکھیئے کہ مودودی صاحب اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ ۲۶ جنوری کے ہفتہ وار ایشیا میں سوال اور جواب کی شکل میں مودودی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے جو غور طلب ہیں۔ ایک سوال یہ تھا کہ

> کیا اسلام نے کوئی معاشی نظام تجویز کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو اس نظام کا خاکہ کیا ہے۔ اور اس خاکہ میں زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم کا مقام کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

پہلے سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ آیا اسلام نے کوئی معاشی نظام تجویز کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو اس نظام کا خاکہ

کیا ہے؟ اور دوسرا حصہ یہ کہ اس میں زمین، محنت، سرمایے اور تنظیم کا کیا مقام ہے؟ سوال کے پہلے حصے کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے یقیناً ایک معاشی نظام تجویز کیا ہے۔ مگر اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ مفصل معاشی نظام اس نے ہر زمانے کے لئے بنا کر رکھ دیا ہے جس میں معاشی زندگی کے متعلق تمام تفصیلات طے کر دی گئی ہیں۔ بلکہ در اصل اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے ہمیں ایسے بنیادی اُصول دیئے ہیں جن کی بنا پر ہم ہر زمانے کے لئے ایک معاشی نظام خود بنا سکتے ہیں۔ اسلام کا قاعدہ یہ ہے اور قرآن وحدیث بغور پڑھنے سے وہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق وہ ایک حدودِ اربعہ (FOUR CORNERS) مقرر کر دیتا ہے اور ہمیں بتا دیتا ہے کہ یہ حدود ہیں جن میں تم اپنی زندگی کے اس شعبہ کی تشکیل کرو۔ ان حدود سے باہر تم نہیں جا سکتے، البتہ ان حدود کے اندر تم اپنے خیالات، ضروریات اور تجربات کے مطابق تفصیلات طے کر سکتے ہو۔ نجی معاملات سے لے کر تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں تک اسلام نے انسان کی رہنمائی اسی طریقے پر کی ہے اور یہی اس کا طریق رہنمائی ہمارے نظامِ معیشت کے بارے میں بھی ہے۔ یہاں بھی اس نے کچھ اصول ہم کو دے دیئے ہیں اور کچھ حدودِ اربعہ مقرر کر دیئے ہیں تاکہ ان کے اندر ہم اپنے معاشی نظام کی صورت گری کریں۔ تفصیلات طے کرنے کا کام ہر زمانے کے لحاظ سے ہونا چاہیئے اور ہوتا رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ انہی حدودِ اربعہ کے اندر ہمارے فقہاء نے اپنے زمانے میں معاشی نظام کے احکام بڑی تفصیل سے مرتب کئے تھے جو فقہ کی کتابوں میں ہمیں ملتے ہیں۔ فقہاء نے جو مرتب کیا ہے وہ ان اصولوں سے ماخوذ ہے جو اسلام نے دیئے ہیں اور ان حدود سے محدود ہے جو اس نے مقرر کر دی ہیں۔ ان تفصیلات میں سے جو چیزیں آج بھی ہماری ضروریات کے مطابق ہیں ان کو ہم جوں کا توں لے لیں گے۔ اور جو نئی ضروریات اب ہمیں لاحق ہیں ان کے لئے ہم مزید احکام استخراج کر سکتے ہیں لیکن وہ لازماً اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں سے ماخوذ ہونے چاہئیں اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کے اندر رہنے چاہئیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ بعینہٖ وہی مسلک ہے جسے طلوعِ اسلام مدتوں سے پیش کرتا چلا آرہا ہے اور جس کی وجہ سے وہ ان حضرات کی نگاہوں میں اس قدر معتوب ہے۔

لیکن آپ اس سے مطمئن نہ ہو جائیں کہ ان صاحب نے بالآخر ایک صحیح بات کو تسلیم کر لیا۔ انہوں نے یہ بھی تو کہہ رکھا ہے کہ "پاکستان میں حنفی حضرات کی اکثریت ہے اس لئے یہاں حنفی فقہ رائج ہو جائی

چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ صاحب کس طرح اپنے جھولے میں ہر قسم کی متضاد چیزیں رکھتے ہیں کہ جس وقت جس کی ضرورت ہو اُسے نکال کر پیش کر دیا جائے!

(٥)

۲۔ فطری طبقات

اسی "سوال اور جواب" کے سلسلہ میں مودودی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :-

> اسلام انسانی وحدت و اخوت کا علمبردار اور تفرقہ و تصادم کا مخالف ہے۔ اس لئے وہ انسانی معاشرہ کو طبقات میں تقسیم نہیں کرتا۔ اور فطری طور پر جو طبقات موجود ہیں، ان کو طبقاتی نزاع کے بجائے ہمدردی اور تعاون کی راہ دکھاتا ہے۔ (ایشیا ۲۶ ۱/۶۹)

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کون سے طبقات ہیں جن میں انسانوں کو فطرت تقسیم کرتی ہے؟ ہندوؤں کے ہاں تو یہ عقیدہ موجود ہے کہ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کی طبقاتی تقسیم فطری ہے۔ کیا اسلام میں کوئی اس قسم کی فطری طبقاتی تقسیم ہے؟ اگر آپ کی مراد غریبوں اور امیروں کے طبقات سے ہے، تو کیا یہ تقسیم فطرت کی طرف سے ہوتی ہے یا انسانوں کے خود ساختہ تمدنی اور معاشی نظام کی پیداوار ہے؟ فطرت کی طرف سے تو نہ کوئی بچہ امیر پیدا ہوتا ہے نہ غریب۔ غریب اور امیر والدین کے بچے ایک جیسے پیدا ہوتے ہیں، اور یہ انسانوں کا باطل نظام ہے جو انہیں طبقات میں تقسیم کر دیتا ہے۔

(٥)

۳۔ اسلامی حکومت میں اپوزیشن

مودودی صاحب سے سوال کیا گیا — کیا اسلامی حکومت میں اپوزیشن کا تصور بھی ہوگا؟ — انہوں نے جواب میں کہا۔

> ہاں۔ اسلامی حکومت میں اپوزیشن بھی ہوگی اور اسے کام کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ اگر عوام اس کے پروگرام کو زیادہ بہتر سمجھیں گے اور انتخابات کے ذریعے اسے منتخب کرلیں گے تو حکمرانی اسی کے لئے ہوگی۔ (ایضاً)

طلوع اسلام - اسلامی حکومت میں اپوزیشن؟ یا للعجب! اسلامی حکومت عہد رسالتمآب اور

خلافتِ راشدہ میں قائم ہوئی تھی۔ کیا مودودی صاحب بتائیں گے کہ اُس زمانے میں کونسی پارٹی اپوزیشن میں تھی۔ ہمیں تو قرآنِ کریم میں دو ہی پارٹیوں کا ذکر ملتا ہے ــــ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان۔ اسی تقسیم کی رُو سے اسلامی حکومت میں ایک پارٹی محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی تھی اور دوسری پارٹی ابوجہل اور ابولہب کی۔ یہی پارٹی اسلامی حکومت کے مقابلہ میں اپوزیشن میں تھی۔

لیکن یہ تو ہے مودودی صاحب کا آج کا اسلام جب یہ خود ایک پارٹی بنا کر اپوزیشن میں شامل ہیں۔ جس وقت انہوں نے ابھی اپنی پارٹی نہیں بنائی تھی، اُس وقت کا اسلام کیا تھا، اسے غور سے سنیئے۔ مودودی صاحب نے فروری ۱۹۳۸ء کے "پیغامِ حق" میں ایک طویل مقالہ لکھا تھا جس میں کہا تھا کہ

> یہ قوم (یعنی مسلمان) تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی فردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ انہیں اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ بازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔

پھر انہوں نے اپنی "دستوری تجاویز" میں لکھا تھا۔

> مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا از روئے دستور ممنوع ہونا چاہیئے۔

یہ اُس وقت کا اسلام تھا اور آج کے اسلام کی رُو سے نہ صرف پارٹیاں بنانا عین مطابقِ اسلام ہے بلکہ اسلامی حکومت میں اپوزیشن کا وجود بھی لاینفک ہے۔ سچ ہے۔ "مزاج شناسِ رسول" کو حق پہنچتا ہے کہ جس قسم کا اسلام اس کی مصلحتوں کے موافق ہو، وضع کرتا جائے۔

(۰)

۴۔ اسلامی ممالک کی کانفرنس

مرکزی اسمبلی کی حالیہ نشست میں، وزیرِ امورِ خارجہ میاں ارشد حسین صاحب نے اس حقیقت کا انکشاف فرمایا کہ ملائشیا کی تحریک پر، مختلف اسلامی ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ جس کی دعوت، پاکستان کے علاوہ حسبِ ذیل ممالک نے قبول کرنی ہے۔ افغانستان۔ الجیریا۔ انڈونیشیا،

ایران، عراق، اردن، مراکو، کویت، سعودی عرب، شام، ٹیونس، ترکی۔ اور متحدہ عرب جمہوریہ۔ ہی خواہانِ اسلام کے نزدیک (اصولی اعتبار سے) یہ خبر جس قدر خوش کن ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس کانفرنس میں، ان اہم مسائل کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی جائے گی جن سے اس وقت تمام عالمِ اسلام دوچار ہے اور جن کی وجہ سے مسلمان عجیب مشکلات کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن ملاحظہ فرمائیے کہ اس میں کون سے مسائل زیرِ بحث آئینگے۔ (۱) روزے ۔۔ اس ماہ کے آغاز اور اختتام کا کا تعین۔ (۲) عید الفطر اور عید الاضحےٰ ۔۔ ان کی تاریخوں کا تعین ۔۔ (۳) نمازوں کے اوقات کا تعین۔ (۴) زکوٰۃ اور فطرانہ ۔۔ ان کے جمع اور خرچ کرنے سے متعلق اصول۔ (۵) بلا سود بنکنگ۔ (۶) تجارت۔ (۷) فیملی پلاننگ۔ (۸) عائلی قوانین۔ (۹) مسلمانوں کی تعلیم۔ (۱۰) دعوتِ اسلام۔ (۱۱) اسلامی نقطۂ نظر سے مسئلہ بیت المقدس کا مطالعہ۔ (۱۲) وراثت اور وصیت سے متعلق قوانین۔ (۱۳) ٹیکس۔ (۱۴) دیگر مذہبی امور جنہیں شرکائے کانفرنس تجویز کریں۔

اول تو ان مسائل کے متعلق بحث و تمحیص کا جو نتیجہ برآمد ہوگا، وہی ظاہر ہے۔ لیکن غور طلب سوال یہ ہے کہ آج، جبکہ دنیا میں مسلمانوں کا ملی وجود ہی خطرہ میں ہے، کیا دنیا بھر کے اسلامی ممالک کے اجتماع میں غور و فکر کے لئے کوئی بنیادی اجتماعی مسائل تجویز نہیں کئے جا سکتے تھے؟

(٠)

۵۔ انگلستان میں تبلیغِ اسلام

مودودی صاحب گزشتہ سال، علاج کی غرض سے لندن تشریف لے گئے تو اپنی فرصت کے اوقات میں، "تبلیغِ اسلام" بھی فرماتے رہے۔ یہ تبلیغ کس قسم کی تھی، اس کا اندازہ دو ایک سوالات کے جوابات سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً غلامی سے متعلق سوال کے جواب کے سلسلہ میں آپ نے فرمایا۔

> دراصل مغربی قومیں اسلام کو مطعون کرنے کے لئے بلا وجہ غلامی کے مسئلے کو اچھالتی رہتی ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام نے جو حقوق جنگی قیدیوں کو عطا کئے ہیں وہ دنیا میں کہیں بھی جنگی قیدیوں کو حاصل نہیں ہیں۔ گزشتہ صدی سے قبل مسلمانوں کے سوا کسی دوسری قوم کے پاس جنگی قیدیوں کے تبادلے کا کوئی قانون نہیں تھا۔ اب جنیوا کنونشن اور ایسے ہی دوسری بین الاقوامی کانفرنسوں میں جو فیصلے ہوئے ہیں ان کی حیثیت قانونی نہیں ہے بلکہ فریقین کے درمیان ایک معاہدے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چاہیں تو وہ اس پر عمل کریں اور چاہیں تو نہیں

رد کر دیں۔اس کے برعکس اسلام جنگی قیدیوں کا ایک مستقل قانون رکھتا ہے جس پر مسلمان عمل کرنے کے لئے اخلاقی طور پر مجبور ہیں۔

اگر اسلام میں یہ قانون ہوتا کہ دشمن کے تمام قیدی رہا کر دیئے جائیں تو کبھی دشمن قیدیوں کے تبادلے پر راضی نہ ہوتا اور یوں مسلمان قیدی ہمیشہ دشمن کے قبضے میں رہتے۔اسلام نے اس کا صحیح اور فطری حل یہ نکالا ہے کہ اگر کوئی دشمن اپنے قیدیوں کو مسلمان قیدیوں سے بدلنے پر تیار نہ ہو تو اسلامی حکومت انہیں مسلمانوں میں تقسیم کر دے۔اس طرح ان تمام اخلاقی مفاسد کا بھی سدباب ہو جاتا ہے جو انہیں مجتمع رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک اسلامی معاشرہ میں رہ کر وہ اسلام کی حقیقت کو بھی سمجھ جاتے ہیں۔قیدی عورت جسے لونڈی کہا جاتا ہے اپنے مالک کے انتقال کے بعد خود بخود آزاد ہو جاتی ہے اور اس کی اولاد محصنہ کی اولاد کے برابر حقوق رکھتی ہے۔

(ایشیا۔۲۴ نومبر ۱۹۶۸ء)

مودودی صاحب نے اس کی تشریح نہیں فرمائی کہ جس اسلام کی یہ تبلیغ فرما رہے ہیں (اور جسے حقیقی اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں) اس نے غلاموں کو (یعنی جنگی قیدیوں کو جنہیں غلام بنایا جائے گا) کیا کیا حقوق عطا فرمائے ہیں اس کی تشریح ہم کئے دیتے ہیں۔

(۱) غلام اپنی کمائی کے ایک پیسے کا بھی مالک نہیں بن سکتا۔

(۲) غلام کا بیٹا بھی غلام ہوتا ہے (حتیٰ کہ اگر غیر مسلم غلام مسلمان ہو جائے وہ تب بھی غلام ہی رہتا ہے)

(۳) مالک کا جب جی چاہے اُسے جس کے ہاتھوں جی چاہے فروخت کیا جا سکتا ہے۔

(۴) غلام عورت (یعنی لونڈی) سے بلا نکاح جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں۔اس میں تعداد کا بھی کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔

(۵) جس لونڈی سے اس طرح جنسی تمتع کیا جائے اس کا درجہ شریف بیبیوں جیسا نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس کی اولاد پر بھی پرستار زادگی کا داغ رہتا ہے۔

(۶) لونڈیوں کے ساتھ ہم بستری کی صورت میں عزل بھی کیا جا سکتا ہے اور نوا طلت بھی۔

(۷) اور جب جی بھر جائے تو لونڈی کو کسی دوسرے کے پاس فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔

ان احکام کے مصالح مودودی صاحب کی زبان سے سنیئے۔فرماتے ہیں۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات

قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جائیں۔ (تفہیمات حصہ دوم۔ ص ۳۲۳)

تعداد کے سلسلہ میں ارشاد ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو اس سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے جبکہ لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو۔ (ایضاً ص ۳۲۴)

لونڈیوں کو فروخت کر دینے کی مصلحت کے متعلق ارشاد ہے۔

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا آپ کو اتفاق ہوا ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمات لینا کوئی آسان کام نہیں۔ اور اسی طرح دشمن کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا بھی کوئی کھیل نہیں۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد اور عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے اس کے حقوقِ ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ جس کے بھی حوالے کئے جاتے اس کے حق میں بلائے جان بن جاتے۔ (ایضاً۔ ص ۳۲۳)

امید ہے ان تشریحات کے بعد اقوامِ یورپ جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائینگی۔

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے غلامی کو یکسر بند کر دیا ہے اور اس میں جن غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر آتا ہے، وہ وہ ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت معاشرہ میں پہلے سے موجود تھے۔

(۲) تعددِ ازدواج

اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

اسی طرح جب ہمارے تعددِ ازدواج پر اہلِ مغرب کی طرف سے اعتراض کیا گیا تو ہمارے ہاں کے اہلِ علم اور اہلِ قلم اس پر شرمندہ ہو کر طرح طرح کی معذرتیں پیش کرنے لگے اور انہوں نے آنکھیں کھول کر یہ نہ دیکھا کہ یک زوجی (MONOGAMY) کو قانون قرار دے کر اہلِ مغرب نے

ایک بہت بڑی نادانی کا ارتکاب کیا ہے جس کا بدترین خمیازہ وہ آج بھگت رہے ہیں۔ اس کی بدولت ان کے ہاں غیرقانونی تعدّدِ ازواج نے رواج پایا جو کسی ضابطہ کا پابند نہیں اور جس کے ساتھ کسی ذمہ داری کا بار نہیں۔ اسی کی بدولت ان پر کثرتِ طلاق کی وبا مسلط ہوئی جو روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اسی کی بدولت ان کے ہاں ناجائز بچوں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ خاندانی نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ برباد شدہ گھروں (BROKEN HOMES) کے بچے ایک پریشان کن مسئلہ بن گئے ہیں اور کمسنی کے جرائم روز افزوں ترقی پر ہیں۔ ان ساری چیزوں کو پیش کر کے معترضین کو شرم دلانے کے بجائے ہم خود اپنے قانونِ تعدّدِ ازواج پر شرمانے لگے اور اس میں ترمیم کرنے پر تُل گئے"۔ (ترجمان القرآن۔ جنوری ۶۹ء۔ ص ۲۵)

یعنی مودودی صاحب کے نزدیک، اقوامِ مغرب میں اس قدر فحاشی کی وجہ ان کا قانونِ یک زوجگی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ غور فرمایئے کہ

(۱) ہمارے ہاں ایک سے زیادہ بیویاں مستثنیات میں سے ہیں۔ اور عام طور پر ایک مرد کے ہاں ایک ہی بیوی ہوتی ہے۔ کیا اس کا نتیجہ وہی ہے جس کا مودودی صاحب نے اقوامِ یورپ کے ہاں ذکر کیا ہے؟

(۲) مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں میں بالعموم تعددِ ازواج کا رواج ہے۔ کیا وہاں فحاشی ختم ہو چکی ہے؟

اب ایک قدم آگے بڑھیئے۔ ان حضرات کے نزدیک انسان (معاف بفرمائیے) ایک ایسا حیوان ہے جو ہر وقت جنسی خواہش کی تسکین کے لئے بدست رہتا ہے۔ اگر اسے دو چار بیویاں نہ دی جائیں تو وہ بدکرداری پر اُتر آتا ہے۔

(۲) ان کے نزدیک شادی سے مقصد صرف جنسی جذبہ کی تسکین ہے۔ اگر یہ مقصد ایک بیوی سے پورا نہیں ہوتا تو مرد کو ایک اور عورت مل جانی چاہیئے، جیسے کہ تین چار۔

(۳) "اسلام" (یعنی ان حضرات کے تصور کے اسلام) کی افضلیت کا یہ ثبوت ہے کہ اس نے مردوں کی جنسی خواہش کی کماحقہ تسکین کا سامان (چار بیویوں کی اجازت کی رُو سے) فراہم کر دیا ہے۔ —— اُف!

انہیں کون بتائے کہ مغرب میں فحاشی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عصمت کو ایک مستقل قدر کی حیثیت حاصل نہیں۔ ان کے ہاں جنسی تعلق محض سوسائٹی کا مسئلہ ہے۔ اس لئے جب سوسائٹی فحاشی کو معیوب تصور نہ کرے تو اسے روکنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اسلام میں عصمت ایک مستقل قدرِ انسانیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسے ایک سچا مسلمان کسی قیمت پر ضائع نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان لوگوں سے جنہیں شادی میسر نہ آسکتی ہو کہا ہے کہ وہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔ اور یہی عقیدہ فحاشی کی روک تھام کر سکتا ہے۔ جو عصمت کی قدر پامیان نہ رکھے اُسے چار چھوڑ دس بیویاں بھی دے دو' وہ پھر بھی بدعنوانی سے باز نہیں آئے گا۔

باقی رہا اسلام میں تعددِ ازواج کا سوال، سو قرآن کی رو سے' اصول یک زوجگی کا ہے۔ اس میں اس وقت استثنا کی اجازت دی گئی ہے جب کسی خاص وجہ سے معاشرہ میں ناکتخدا لڑکیوں یا بیوہ عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے اور اس قومی مسئلہ کا حل تعددِ ازواج کے سوا کوئی اور نہ نظر آئے۔ لہٰذا اسلام میں تعددِ ازواج' بے سہارا عورتوں کے لئے باعزت حصارِ عافیت مہیا کرنے کے لئے ہے' نہ کہ مردوں کی جنسی خواہش کی تسکین کے لئے۔

۱۰۔ قرآن مجید کی حنفی تفسیر

اس اقتباس کو غور سے پڑھیے۔

"صدیوں سے ہمارا سرمایہ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختۂ مشق ہے۔ یعنی تفاسیر، احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علما کے قلم سے تیار ہوتے رہے۔ کوئی بری بات نہیں علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو خوش آئند ہے، جس جماعت کی جانب سے ہو قابلِ پذیرائی ہے۔ مگر افسوس "علم" جیسے لازوال، ابدیت نشان، سب کی دولت، سب کے سرمایہ کو ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث کی طول و طویل کتابیں بھی بن گئیں۔ بہر حال جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی نقطۂ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو"

(تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ از مولانا سید انظر شاہ مدرس دارالعلوم دیوبند پارہ اول کا جزو اول - ص ۲)

اب آپ نے سمجھا کہ ہر فرقہ کا قرآن کس طرح الگ الگ ہو گیا ہے؟ اور یہ بھی کہ مروجہ تفاسیر (اور ان پر مبنی تراجم) کی رو سے کس قسم کا قرآن آپ کے سامنے آسکتا ہے؟ سچ کہا تھا حکیم الامتؒ نے کہ

زمن بر صوفی و ملّا سلامے　　　کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت　　　خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

۲۔ آہ! بیچاری عورتیں

صدر ایوب کے عہد حکومت کے جن کارناموں کا تذکرہ آنے والا مورخ خوش آئند الفاظ میں کرے گا ان میں ایک عائلی قوانین کا اجرا بھی ہے۔ ہرچند ان قوانین کی رو سے، ہمارے معاشرہ کے سب سے زیادہ مظلوم طبقہ ـــ یعنی عورتوں ـــ کی کماحقہ، دادرسی نہیں ہو سکی لیکن بایں ہمہ یہ سابقہ قوانین کے مقابلہ میں، مبنی برانصاف بھی ہیں اور قرآن کریم سے قریب تر بھی۔

لیکن یہی قوانین ہیں جن کی، ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے سخت مخالفت ہو رہی ہے حتیٰ کہ بعض "علمائے کرام" کی طرف سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ صدر ایوب سے مفاہمت کے سلسلہ میں ایک شرط یہ بھی ہونی چاہیئے کہ ان قوانین کو منسوخ کر دیا جائے۔

قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ان قوانین کی مخالفت، قابل فہم ہے، اس لئے کہ ان حضرات کے "اسلام" کی رُو سے، عورت بنی ہی اس لئے ہے کہ مرد اس پر حکومت کرے۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ پچھلے دنوں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے جو ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی، اس نے بھی اپنی رپورٹ میں ان قوانین کی مخالفت کی ہے۔

ہم ان حضرات کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ ان کے دل میں اگر قوم کی بیٹیوں کا کوئی درد نہیں تو کم ازکم اتنا ہی سوچیں کہ ان کی اپنی بھی بہنیں اور بیٹیاں ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ ان قوانین کی جگہ اگر وہی سابقہ قوانین پھر بروئے کار آ جائیں تو ان بیچاریوں کے لئے مردوں کی سفاکی سے حفاظت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی؟

اور اس کے بعد ہم پوچھنا چاہتے ہیں ملک میں خواتین کی مختلف انجمنوں اور اداروں سے کہ انہیں اپنے حقوق کی حفاظت کا کوئی خیال ہے یا نہیں؟

—————— (*) ——————

بالآخر یہیں آنا پڑیگا

اس تقریر کے الفاظ غور سے پڑھیئے:۔

.......نے کہا کہ ــــ "اسلام اجتماعی مفادات کے وسائل کو قومی ملکیت میں لینے کا حامی ہے۔ اور جو لوگ قومی ملکیت کو اسلام کے منافی کہتے ہیں وہ اسلام اور اس ملک کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔ ملک میں اس وقت تک ایک فلاحی معاشرہ قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ موجودہ معاشی نظام کو سرے سے ہی

بدل نہ دیا جائے اور ایک ایسا معاشی نظام لایا جائے جہاں ہر انسان دو وقت کی روٹی عزت کے ساتھ کھا سکے۔ سر چھپانے کے لئے جگہ حاصل کر سکے۔ اپنے بچوں کی تعلیم حاصل کر سکے۔ اسے علاج معالجہ کی سہولتیں حاصل ہوں۔ (یاد رکھئے!) جو علماء معاشی مساوات کی ترویج میں رکاوٹ بن رہے ہیں وہ قوم کو مذہب سے دور لے جا رہے ہیں اور اس نسل کو اسلام سے بدظن کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بنیادی حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ آج پاکستان کا سب سے بنیادی اور مشکل مسئلہ صرف معاشی مسئلہ ہے۔ ہر معاشرے اور مذہب نے سب سے پہلے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور جو معاشرہ اور مذہب اس مسئلہ کے بارے میں آنکھیں بند کر لیتا ہے وہ کبھی ترقی پذیر نہیں ہو سکتا ــــ (آپ کو معلوم ہے کہ) قرآن کریم میں یہ بار بار ذکر آیا ہے کہ ہر شخص کی روزی کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے اور آج یہ ہو رہا ہے کہ ایک غریب آدمی دو وقت کی روٹی کے لئے بھی محتاج ہے۔ اس کے بچے دوا نہ ملنے کے باعث چل بستے ہیں۔ اس کی جوان بیٹیاں معمولی کپڑوں کو ترستی ہیں اور دوسری طرف ایک طبقہ عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتا ہے۔ ملیں ریشم کے تھان کے تھان تیار کرتی ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جب ہر شخص کی روزی کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے تو پھر یہ معاشی ناہمواری کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم نے ان آیاتِ قرآنی کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔ اس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد کا رزق اس معاشرہ اور سوسائٹی کے ذمے ہے جو خدا اور اسلام کے احکام کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔ اور جو معاشرہ یہ فرض پورا نہیں کرتا وہ اسلامی معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ (یاد رکھو!) پاکستان میں ایسا معاشرہ قائم کرنا پڑے گا جہاں رات کو کوئی بھوکا نہ سوئے۔ کوئی اپنی زندگی منت پاؤں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ گذارے۔ ہر شخص آبرومندانہ زندگی بسر کرے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ معاشی نظام کو بدلا جائے۔ (یہاں) کچھ لوگ مذہب کے نام پر سرمایہ داری کا تحفظ کرتے ہیں اور سرمایہ داری انسانیت کی توہین ہے۔ اور کچھ لوگ جاگیرداری کا تحفظ بھی مذہب کے نام پر کرتے ہیں اور اس جاگیرداری نے انسان کے خون کو جونک بن کر چوس رکھا ہے۔ اسلام چونکہ انسانیت کا دین ہے سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف ہے جو علماء معاشی مساوات کی ترقی میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں وہ اسلام کے ساتھ بہت بڑی دشمنی کر رہے ہیں۔ (انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ) جب تک موجودہ معاشی نظام میں تبدیلی نہیں کی جائے گی لوگ مذہب سے دور ہٹتے جائیں گے۔ لوگوں کو عقیدہ کے ساتھ دو وقت کی روٹی بھی ملنی چاہیئے کیونکہ صرف عقیدہ سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔ اسلام اجتماعی مفادات کے تمام وسائل قومی ملکیت میں لینے کے حق میں ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ پانی، گھاس اور آگ پر سب کا حق ہے۔ یہ قومی ملکیت کی چیزیں ہیں۔ وقت کے ساتھ اجتماعی مفادات کے وسیلے بھی بدل گئے ہیں۔ اب ان میں بجلی، ٹرانسپورٹ، صنعتیں، پٹرولیم، تیل اور

دوسری چیزیں بھی شامل ہیں اور حضورؐ کے فرمان کے مطابق' ان کو قومی ملکیت میں لیا جانا چاہیئے۔ جو شخص اس بات میں رکاوٹ ڈالے گا وہ اسلامی روح سے بے خبر ہے اور اسے مذہب کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینے کا کوئی حق نہیں ہے "

آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہوں گے اور دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تقریر ہے پرویز صاحب کی اور تقریب ہے طلوعِ اسلام کی کنونشن یا ان کا ہفتہ واری درس۔ لیکن' نہ تو یہ پرویز صاحب کی تقریر ہے اور نہ ہی تقریب' طلوعِ اسلام کنونیشن یا ہفتہ واری درس ہے۔۔۔ مقرر ہیں مولانا کوثر نیازی صاحب' اور تقریب ہے مرکزی پان سگریٹ فروش یونین کا جلسہ جو لاہور میں ۱۶ر فروری کو منعقد ہوا اور جس کی روئیداد ۱۷ر فروری کے روزنامہ مشرق میں شائع ہوئی۔ اور یہ وہی کوثر نیازی صاحب ہیں جو ابھی کل تک (اپنے اخبار شہاب میں) پرویز صاحب کے پیش کردہ نظامِ ربوبیت کا مذاق اڑاتے اور اسے خلافِ اسلام قرار دیا کرتے تھے۔ آپ نے غور فرمایا کہ زمانے کے تقاضے انسان کو کس طرح قرآنی حقائق کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں!

طلوعِ اسلام اپنی اس سعادتِ کبریٰ پر جس قدر بھی فخر و ناز کرے کم ہے کہ مبداء فیض کی کرم گستری نے اسے اس کی توفیق عطا فرمائی کہ وہ قرآن کریم کے معاشی نظام کو چشمِ بصیرت سے دیکھے اور اسے اس وقت قوم کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرے جب اس پر اس جرم کی پاداش میں چاروں طرف سے کفر کے فتووں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس موہبتِ عظمےٰ پر اس کا سرِ نیاز بدرگاہ رب العزت سجدہ ریز ہے۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ حَمْدًا کَثِیْرًا۔

——— (پ) ———

انگلستان میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات

مندرجہ ذیل پتہ سے مل سکتی ہیں!

مسٹر رشید احمد بٹ۔ ۱۴۰ سالٹ سٹریٹ بریڈ فورڈ ۸ یو۔ کے۔۔

[BRADFORD - 8, U.K.]

گھر کی شہادت

شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا

گذشتہ چند سالوں میں، پاکستانی معاشرہ میں جو خرابیاں رونما ہوئیں، ہم ساتھ کے ساتھ انکی نشاندہی کرتے، اور ان کی طرف اربابِ حل وعقد کی توجہ منعطف کراتے رہے۔ لیکن ان حضرات نے انہیں ایک معترض کی تنقید بے جا قرار دے کر، درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور معاشرہ خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔ لیکن اب ایک ایسی شہادت سامنے آئی ہے جسے یہ حضرات یہ کہہ کر مسترد نہیں کر سکتے کہ یہ محض معترضین کی تنقید بے جا ہے۔ ہوا یوں کہ مغربی پاکستان اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے اپنی جماعت کی تنظیم، حکومت کے نظم و نسق، اور عوامی مسائل کا جائزہ لینے کے لئے، بیس ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جس کے صدر چوہدری محمد نواز (ایم۔پی۔اے) تھے۔ اس کمیٹی نے حالات کا جائزہ لے کر ایک مفصل رپورٹ پیش کی جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے چیدہ چیدہ نکات پیشِ قارئین ہیں۔

۱۔ مسلم لیگ کی حیثیت

اس سلسلہ میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ (۱) جس انداز سے مسلم لیگ کے ممبر بنائے گئے ہیں، اس کی رُو سے، اس کے نوّے فیصد ممبر جعلی ہیں، اور جماعت، سرمایہ داروں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔

(۲) پارٹی کے لئے جو آئین مرتب کیا گیا اس کا کبھی احترام نہیں کیا گیا بلکہ اسے موم کا کھلونا بنا دیا گیا کہ جیسی ضرورت پڑی اس کے مطابق اس کی شکل بدل لی۔ بلکہ اس کی خلاف ورزی کی گئی اور سنجیدگی سے اس پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔

(۳) اگرچہ پارٹی کے انتخابات کی رسم پوری کر دی گئی لیکن کسی مرحلہ پر بھی مسلم لیگیوں کو آزادانہ انتخاب کا موقعہ نہیں دیا گیا۔

(۴) یونین مسلم لیگ سے بے کراؤ پرنگ بیشتر عہدیداروں کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ وہ اوپر سے مسلط کر دیئے گئے ہیں۔

۲۔ موجودہ بے چینی کے اسباب

اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ ـــ کمیٹی کے خیال میں موجودہ بے چینی کا اصل سبب بڑھتی ہوئی بیروزگاری ہے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی خطرناک حد تک بڑی تعداد جو لاکھوں میں ہے' بیروزگاری کا شکار ہے۔ اس ضمن میں حکومت کی طرف سے ایک جرأت مندانہ اقدام کی ضرورت ہے اور مسلم لیگ کا کام ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ یہ جرأت مندانہ اقدام اٹھایا جائے۔ مسئلہ کا ایک اور پہلو جو کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا یہ ہے کہ تمام لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع نہیں دیئے جاتے۔ صوبے میں تعلیم کے مختلف نظام رائج ہیں۔ کچھ ادارے تو واقعی بڑے اچھے اور معیاری ہیں لیکن اکثر صورتوں میں معاشرے کے چھوٹے طبقوں سے تعلق رکھنے والے بچے جن کے والدین کے ذرائع آمدنی محدود ہوتے ہیں ان اداروں میں داخلے کو ناممکن پاتے ہیں۔ دیہی علاقوں کے اکثر و بیشتر سکول بنیادی ضروریات ہی سے محروم ہیں۔

۳۔ عوام کے مسائل

اس ضمن میں کہا گیا ہے کہ ـــ رشوت، نااہل اور عام آدمی کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں عام حکام کی عدم دلچسپی کے معاملات بھی کمیٹی کے نوٹس میں لائے گئے۔ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والے بیشتر ارکان نے اس موضوع پر کھل کر بات کی اور اسے ہی موجودہ بے چینی کا اہم ترین سبب بتایا۔ ان کی رائے میں ہمارے اعلیٰ افسر "رپ دان ونکل" کی طرح ہیں اور ابھی تک نیند سے جاگے نہیں ہیں۔ انہیں ابھی تک یہ احساس نہیں ہو سکا ہے کہ برطانوی راج ختم ہو چکا ہے۔ اور اکڑی ہوئی گردن اور ستھرے لباس والا مغرب زدہ سرکاری افسر جو عوام سے دور دور رہنا پسند کرتا تھا اب گزرے ہوئے زمانے کی مخلوق ہے۔ آج پاکستان میں ایسے افسر کی ضرورت ہے جو یہ جان لے کہ وہ عوام میں سے ہے اور عوام کی خدمت کے لئے افسر بنا ہے۔ یعنی ایسا افسر جو زندگی کی اسلامی اقدار پر زور دے اور غرور پر انکساری کو ترجیح دے۔ آج کا افسر ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ عوام میں گھلے ملے۔ عوام کی اس تک آسانی سے رسائی ہو سکے اور بہ حیثیت پر اپنے ہی ذرائع کے مطابق زندگی گزارے۔

ایک طرف عوام کا وقار اس حد تک گھٹ گیا ہے کہ ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے اور دوسری طرف افسروں کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ اس صورت حال نے انتظامیہ کو مکمل طور پر برباد کر دیا ہے کہتے ہیں

اختیار آدمی کو بدعنوان بنا دیتا ہے اور پاکستان میں اعلیٰ سرکاری افسروں کو جو لامحدود اختیارات حاصل ہیں اس کا نتیجہ صرف یہی نکلا ہے کہ بڑے پیمانے پر بدعنوانی پیدا ہوئی ہے۔

۴۔ رشوت ستانی

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ــــ انسداد رشوت کا شعبہ اپنے طور پر بے اثر ہو کر رہ گیا ہے اور بس کلرکوں اور سپرنٹنڈنٹوں کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ جب کہ افسر بالا ہر قسم کے خوف سے عاری اپنے کام میں مصروف ہے۔ محل نما بنگلے اور بیش قیمت کاریں تقریباً ہر سرکاری افسر کا نصب العین ہیں اور اسے اس سے سروکار نہیں کہ وہ کس طرح اپنے اس نصب العین کو حاصل کرتا ہے۔

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ــــ تنخواہوں کے نظام میں عدم توازن جس کی وجہ سے نچلے عملے کو بہت معمولی تنخواہیں ملتی ہیں، بدعنوانی کا بہت بڑا سبب ہے۔ ایک طرف افسر ہیں جو نہایت آرام اور آسائش کی زندگی گزارتے ہیں۔ اور دوسری طرف نچلے عملے کے ارکان مصائب و آلام میں مبتلا رہنے پر مجبور ہیں۔ اس صورت حال نے مؤخر الذکر میں عدم اطمینان اور تلخی پیدا کر دی ہے۔ حکومت کے ہر محکمہ میں گروہ بندیاں اور بدعنوان گروہ ہیں اور عوام کا کوئی بھی فرد ان کی خدمت کئے بغیر اپنا کام نہیں کروا سکتا۔

پولیس نے گزشتہ چند سالوں میں ظلم و تشدد اور زیادتیاں کرنے میں نام پیدا کیا ہے۔ یہ شکایت پورے صوبے میں ہر جگہ ملے گی۔ اور خاص طور سے دیہی علاقوں میں۔ اس کا کوئی نہ کوئی علاج دریافت کیا جانا اشد ضروری ہے۔ نچلے درجے کے پولیس ملازمین کی تنخواہ کا از سر نو تعین بھی ضروری ہے۔ جن پر امن و امان برقرار رکھنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ ان کے لئے ذہنی سکون اور یہ اطمینان اشد ضروری ہے کہ وہ اور اس کے بال بچے باعزت زندگی گزار سکتے ہیں۔

۵۔ اقتصادی ترقی

صدر مملکت کی زیر قیادت ملک نے جو اقتصادی ترقی کی ہے اسے رپورٹ میں سراہا گیا ہے لیکن ان کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ ــــ یہ بھی ایک افسوسناک مشاہدہ ہے کہ اس تمام اقتصادی ترقی سے صرف چند افراد کو فائدہ پہنچتا نظر آتا ہے۔ عوام کا تاثر یہ ہے کہ ایک عام آدمی کو اس تمام ترقی سے بہت ہی کم فائدہ پہنچا ہے بلکہ اس کے عین برعکس یہ صاف نظر آتا ہے کہ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا، کمیٹی یہ مشورہ دیتی ہے کہ حکومت اپنی منصوبہ بندی میں نہ صرف ترقی کی رفتار برقرار رکھنے کا لحاظ رکھے بلکہ ساتھ ہی ساتھ

کم مدت کے اندر اس ترقی کے اثرات اور فوائد کو بھی محسوس طور پر عام شہری تک پہنچانے کا بندوبست کرے۔ چند صنعتی اجاروں کو جو ناقابلِ قیاس حد تک مختلف صنعتوں میں دخیل بن چکے ہیں، نئی صنعتوں میں حصہ لینے سے لازماً روک دیا جانا چاہیئے اور موجودہ اور آئندہ ترقیات کی بناء پر جو خوشحالی پیدا ہونا یقینی ہے اس میں سب کے لئے حصہ لینے کی گنجائش نکالنی چاہیئے۔

۶۔ قانون ساز اسمبلیاں

اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں قانون ساز اسمبلیاں عوام کا اعتماد اور احترام حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس کے اسباب و عوامل قطعی ظاہر ہیں اور اس قدر زیادہ ہیں کہ ان پر بحث تحصیل حاصل ہے۔

(۰)

یہ ہیں وہ بڑی بڑی خرابیاں جن کی اس رپورٹ میں نشاندہی کی گئی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ان میں سے کونسی ایسی خرابی ہے جس کی طرف ان صفحات میں ارباب حل و عقد کی توجہ منعطف نہیں کرائی گئی۔ خدا کرے کہ ان حضرات نے اگر ہماری نہیں سنی تو اب اپنوں ہی کی سن لیں!

(۰)

بقیہ "جماعت اسلامی اور دیارِ عرب میں پاکستان کا تعارف" صفحہ ۲۱ سے مسلسل

خود یورپی استعمار کی حامی تھی لیکن عربی ممالک میں جاکر (بھارت کی ہمنوائی میں) پراپیگنڈہ یہ کرتی تھی کہ مسلم لیگ اور قائداعظمؒ یورپی استعمار کے حامی تھے۔ یا للعجب!

(۰)

حرفِ آخر ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں قوم کو جہاں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہاں اسکے کچھ فوائد بھی حاصل ہوئے۔ ان میں سے ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہمارے اکثر عرب بھائی برصغیر کی تقسیم کے اصلی اسباب کو سمجھنے لگ گئے۔ اور وہ ہندوؤں کے جارحانہ عزائم سے کسی حد تک باخبر ہو گئے۔ لیکن حکومت کو اس صورتِ حال پر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیئے۔ ابھی تک حکومت کی کوششیں صرف سفارتی ذرائع تک محدود ہیں۔ ان سے جماعت اسلامی کے پھیلائے ہوئے زہر کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ دیگر مناسب ذرائع بھی اختیار کئے جائیں۔ مثلاً مخلص پاکستانیوں کو دیارِ عرب میں غیر سرکاری طور پر جانے کی سہولتیں بہم پہنچانا وغیرہ۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ نظریۂ پاکستان کے مخالف جماعتوں کے ارکان وقتاً فوقتاً ان ممالک کا چکر لگاتے ہی رہتے ہیں اور پاکستان کیخلاف زہر پھیلاتے رہتے ہیں۔ خدا اس خطۂ پاک کو ہر قسم کے دشمن کی ناوک افگنی کے اثرات سے محفوظ رکھے۔ آمین!

باسمہٖ تعالیٰ

ہندو کیا ہے؟

ایک تاریخی جائزہ اور عبرت انگیز مرقع

طلوع اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۸ء

سے پرویز صاحب کا خطاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندو کیا ہے؟

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر!

ہماری نئی نسل، جو یا تو تقسیمِ ہند کے وقت جھولوں میں تھی، اور یا اس کی پیدائش تشکیلِ پاکستان کے بعد ہوئی، اس اعتبار سے تو ایک گونہ خوش قسمت ہے کہ اسے ہندو کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پڑا، لیکن یہی چیز قوم کے حق میں بڑی مضرت رساں ہے کہ اس نژادِ نو کو معلوم ہی نہیں کہ ہندو کیا ہے؟ اس باب میں خود ہماری حکومتوں نے بھی جو مجرمانہ تغافل برتا، فطرت کبھی اسے معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے نہ تو ان نوجوانوں کی تعلیم کا کوئی ایسا انتظام کیا جس سے وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے کہ ایک الگ مملکت کا وجود کس طرح ہمارے دین کا بنیادی تقاضا تھا — یعنی اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہم اس قابل ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں — اور نہ ہی کوئی ایسی تاریخ مرتب کی گئی جس سے، ان نوجوانوں کو کم از کم اتنا ہی معلوم ہو جاتا کہ ہندو کیا ہے اور کوئی شریف انسان اس کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تاریخ مرتب کرنے سے ہمارا مقصود یہ نہیں کہ ہم اپنے نوجوانوں کے دل میں ہندو کی طرف سے خواہ مخواہ جذبۂ نفرت ابھارنا چاہتے ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ہندو ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجائے تاکہ یہ اُسے اپنے جیسا انسان سمجھ کر اس کے دامِ فریب میں نہ آجائیں۔ غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے کہ

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نہ گفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

یعنی یہ بتانے کے لئے کہ ہم جو اس قدر واویلا مچا رہے ہیں، سیاسی پراپیگنڈہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے یہ ضروری ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا ہے۔ اصل یہ ہے کہ معاملہ پڑے بغیر انسان

جس سے معاملہ پڑے

دوسرے کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے جب ایک شخص نے، کسی دوسرے کے متعلق کہا کہ وہ بڑا نیک اور شریف آدمی ہے، تو آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس کے پڑوس میں رہے ہو۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی کاروبار کیا ہے۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی سفر کیا ہے جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ پھر تم نے لمبے مسجد میں سر اٹھاتے اور سر جھکاتے دیکھا ہوگا اور اس سے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بڑا نیک اور شریف انسان ہے۔ تم یہ کہو کہ وہ بڑی نمازیں پڑھتا اور بہت روزے رکھتا ہے۔ یہ مت کہو کہ وہ بڑا نیک اور شریف انسان ہے۔ یہ اسی وقت کہو جب تمہارا اس کے ساتھ کوئی معاملہ پڑے اور وہ پھر نیک اور شریف ثابت ہو۔ ہماری دشواری یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو ہندو کے ساتھ کبھی واسطہ نہیں پڑا — اور خدا کرے کہ ایسا کبھی نہ ہو — اور نہ ہی ہم نے، جنہیں ان کے ساتھ مدتوں واسطہ پڑتا رہا، انہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا کی ہے کہ ہندو کیا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ہندوستان میں اچھے بھلے بستے رستے تھے۔ ان سے الگ ہو کر ہم نے خواہ مخواہ ایک مستقل خطرہ مول لے لیا؟ اس کی ضرورت کیا تھی؟ وہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں سچے ہیں۔ حیوانات کے لئے آسانی یہ ہے

انسان فریب میں آ سکتا ہے

کہ وہاں ہر نوع کی شکل و صورت جداگانہ ہوتی ہے جس سے انہیں ایک دوسرے کی پہچان میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کسی بکری کو اس میں مغالطہ نہیں لگ سکتا کہ سامنے سے جو جانور آ رہا ہے وہ درندہ شیر ہے یا بے ضرر ہرن۔ لیکن انسانوں کے معاملہ میں صورت یہ نہیں یہاں انسانی پیکر سب ایک جیسے ہوتے ہیں، اس لئے اس باب میں تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ جو دوسرا انسان کھڑا ہے وہ رہزن ہے یا راہ نما۔ ہندوؤں کی شکل و صورت چونکہ انسانوں ہی جیسی ہے اس لئے ہمارے نوجوان انہیں انسان ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ جنہیں وہ (محض پیکروں کے دھوکے میں) انسان سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت کیسے کیسے خونخوار درندے، مہیب نہنگ و اژدر یا مکار لومڑیاں ہیں۔ ان نوجوانوں کے سامنے، ہندو کی ایک خفیف سی جھلک، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران آئی تھی۔ لیکن ایک تو وہ حادثہ ہی، برق کی چمک یا شرارے کی چمک سے زیادہ دیرپا نہ تھا، دوسرے ہم نے ابھی تک اس کی بھی کوئی صحیح اور مکمل تصویر ان کے سامنے آویزاں نہیں کی، اس لئے وہ خفیف سی جھلک بھی ان کے آئینۂ ذہن سے محو ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں آج کی نشست میں، اس بھیروں ماتا، اس کالی دیوی کے چند ایک روپ آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں — چند ایک اس لئے کہ اس کی مکمل تصویر کھینچنے کے لئے، کئی ایک مجلدات کی ضرورت ہے — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے —

میرا خیال ہے کہ انہی چند ایک جھلکیوں سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ ہمارا معاملہ کس کے ساتھ پڑا تھا۔

ہندوؤں کی ساری تاریخ میں' —— اگر اس کہانی مٹی کے پٹارے کو تاریخ کہا جا سکے — صرف ایک سیاسی فلاسفر پیدا ہوا ہے۔ نام تو اس کا چانکیہ تھا' لیکن وہ اپنے آپ کو نہایت فخر سے کوٹلیا کہتا تھا۔ اور

ہندو اُصولِ سیاست

ہندو بھی اسے اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ اس لقب سے ہی آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ ذات شریف تھے کیا؟

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

انہوں نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ارتھ شاستر۔ چونکہ یہ کتاب سنسکرت میں تھی جس کی وجہ سے ہندو جاتی' اس میں درج شدہ اصولوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتی تھی' اس لئے اب اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں سیاست کے جو چند اصول بطور ضابطہ ہدایت دیئے گئے ہیں' وہ قابلِ غور ہیں۔ انہیں ذرا توجہ سے سنئے گا۔

پہلا اصول —— حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول —— ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر ہمیشہ کڑی نگرانی رکھی جائے۔

تیسرا اصول —— غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

چوتھا اصول —— جن سے دوستی رکھی جائے' ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

پانچواں اصول —— دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانہ سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول —— دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پراپیگنڈہ۔ تخریبی کارروائیاں۔ ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ وہاں اپنے آدمی ناجائز طریقہ سے داخل کرکے۔ ففتھ کالم بنایا جائے۔ اور یہ سب کچھ مسلسل انداز سے کیا جائے۔

ساتواں اصول —— رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ اور دوسرے ملکوں کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول ۔۔۔ ان کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا انہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں، سیاست کے وہ اصول جو ان کے ایک مہاتما نے انہیں دیئے۔ یہ مہاتما، ان کے ست جگ کے زمانے کی پیداوار تھے ۔۔۔ یعنی وہ زمانہ جس میں ان کے عقیدہ کے مطابق، بھارت میں سچائی کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد، کل جگ میں ایک اور مہاتما پیدا ہوئے، جنہیں گاندھی جی کہا جاتا ہے۔

گاندھی جی

انہیں سچائی کا مجسمہ اور اہمسا (عدم تشدد) کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان مہاتما جی کی کیفیت کیا تھی، اس کے متعلق قائد اعظمؒ کی زبان سے سنئے جنہیں ان کے ساتھ رات دن واسطہ پڑتا تھا۔ قائد اعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس (منعقدہ ۱۹۴۳ء) میں، پبلک پلیٹ فارم سے کہا تھا کہ:۔

(مشکل یہ ہے کہ) گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۳ء میں، ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے (یعنی مہاتما گاندھی) کے مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل بن نہیں پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بدل لیتے ہیں۔ کہئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستان ہیں۔ معمہ ہیں!

ان کی "مہاآتمیت" کا یہ عالم تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران، جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے، وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لندن پر بمباری کی خبریں پڑھتا ہوں، اور وہاں کے جوانوں۔ بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گذرتی ہے، اسے سنتا ہوں، تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر، جنگ کے سلسلہ میں، بلاشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے۔ اور ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

مہاتما جی نے اُدھر یہ کیا اور اِدھر کانگریس کی مجلس عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا کہ اگر حکومت، ملک کے اختیارات، کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ یہاں کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ —— اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا کہ یہ کیا، تو انہوں نے نہایت معصومیت سے فرمایا کہ میرا کانگریس پر کیا اختیار ہے۔ میں تو اس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں۔

اہمسا کا اوتار

مہاتما گاندھی اپنے آپ کو اہمسا کا اوتار کہا کرتے تھے۔ اہمسا کے معنی یہ ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی کے خلاف تشدد کا استعمال نہ کیا جائے۔ انجیل کی —— ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے کی —— تعلیم پر عمل کیا جائے۔ لیکن انہی مہاتما جی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۳۹ء کے اواخر کی بات ہے، سندھ میں مسجد منزل گاہ کے سلسلہ میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر بے حد مظالم ہوئے۔ ہندوؤں نے یہ سب کچھ بھی کیا اور کوٹلیا کے اصول سیاست کے مطابق، مہاتما جی کو تار دے دیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ نہیں۔ مہاتما جی نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ کسی تحقیق کی ضرورت سمجھی نہ تفتیش کی۔ اور اپنے اخبار میں لکھا کہ

> اہمسا ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ دوسرا طریق وہ ہے جسے دنیا برتتی چلی آ رہی ہے۔ یعنی جان و مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے۔ سندھیوں کو چاہیئے کہ لٹیروں اور حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سیکھیں۔ (ہریجن - بابت ۱۲/۳۹-۱۲)

یہی مہاتما جی ہیں جنہوں نے جنگ کے دوران انگریزوں سے کہا تھا کہ ہٹلر کا مقابلہ ہتھیاروں سے نہ کرو۔ اہمسا کے ذریعہ کرو۔ اور سرحدی گاندھی عبد الغفار خان کو اپدیش دیا تھا کہ پٹھانوں سے ہتھیار چھین لو تاکہ اہمسا میں ذرا سی بھی ہمسا کی لاگ نہ رہے۔ اور دوسری طرف کلکتہ کی ہندو عورتوں سے تاکیداً کہا جاتا تھا کہ اپنے پاس پستول اور بندوق رکھو اور فائر کرنا سیکھو۔ گاندھی جی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ

> میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اُپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں۔ اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں۔ میں گاؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔ (ینگ انڈیا - ۱/۲۱-۱۲)

جو گاؤ رکھشا ان کے دھرم کا جزو تھی، اس کے متعلق انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا تھا کہ

> یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یوروپین کے لئے گاؤکشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس

نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریزی عملداری نے پیدا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہندو بھی، ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ ہندومت، عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤکشی کو بند کر دیں۔ (الفضل - ۳۱/۱۲ - ۹ - بحوالہ اسٹیٹسمین)

یہ تھی سچائی کے اوتار اور اہنسا کے دیوتا گاندھی جی کی کیفیت۔ گاندھی جی کیا تھے، اس کے متعلق قائداعظمؒ نے ایک فقرہ میں وہ کچھ کہہ دیا تھا جس کے لئے کتابوں کی کتابیں بھی کافی نہیں ہو سکتیں۔ بات یوں ہوئی کہ ایک دن گاندھی جی شوگرام آشرم میں، اپنی کٹیا میں بیٹھے پرارتھنا میں محو تھے کہ ایک کونے سے ایک سانپ اندر آ گھسا۔ مہاتما جی خاموشی سے پرارتھنا میں مصروف رہے۔ اس نے کٹیا کا چکر کاٹا اور آہستہ سے باہر چلا گیا۔ ہندو اخبارات نے اسے مہاتما جی کی کرامت قرار دے کر بہت اچھالا۔ صبح کو یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں تو ایک اخبار کا رپورٹر قائداعظمؒ کے پاس گیا اور اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ قائداعظمؒ نے سر ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے کہا کہ

(YES; PROFESSIONAL ETIQUETTE)

یہ وہ ریمارکس ہیں جن کا بس لطف لیا جا سکتا ہے۔ سمجھایا نہیں جا سکتا۔

ہندومت کا ضابطہ اخلاق

جس قوم کے "مہاتما" ایسے ہوں، اس کے عام افراد جس سیرت و کردار کے مالک ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسٹر سری پرکاش پاکستان میں، بھارت کے پہلے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے ۳۰ نومبر ۱۹۴۸ء کی شام، تھیاسوفیکل ہال، کراچی، میں ایک تقریر کی تھی جس کا عنوان تھا "ہندومت ایک ضابطہ اخلاق کی حیثیت سے"۔ اس تقریر میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندومت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے جس پر سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندومت، انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول و اقدار پیش نہیں کرتا بلکہ وہ ہر موقعہ اور ہر مقام کے لحاظ سے، مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ سوسائٹی کے ایک طبقہ (براہمنوں) کو اہنسا (عدم تشدد) کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقہ (کھشتریوں) کو قتل و خون ریزی سکھاتا ہے۔ یا مثلاً وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو لیکن ویش (تجارت پیشہ لوگوں) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے، اس لئے وہ

انہیں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک قسم کے حالات میں صحیح اور دیانت کی تاکید کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندو مت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی (ABSOLUTE) نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو[1]۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت، ہزارہا سال سے، مختلف حالات اور متباین ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ رہے گا۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت دسمبر ۱۹۴۸ء)۔

لال بہادر شاستری

یہی ہے وہ ہندو دھرم، جس کے سب سے بڑے عالم[2] اور ہندوستان کے وزیر اعظم، مسٹر لال بہادر شاستری نے، جنوری ۱۹۶۵ء میں، بنارس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ رویہ ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہی راستہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن و خوش حالی کا ہے جو قوم کے باپو، مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدم تشدد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا ہے وہ نہ صرف فطری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ جب ہم پوری دنیا میں امن و صلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟

(اخبار مدینہ۔ بجنور۔ یکم جنوری ۱۹۶۵ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ فروری ۱۹۶۵ء)

یہ کچھ انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے، جنوری میں کہا، اور اسی سال ستمبر میں، چوروں کی طرح، اکیس ڈویژن فوج، پاکستان کے سر پر لا کھڑی کر دی! سچ ہے۔ اُس قسم کے "باپو" کے اسی قسم کے سپوت ہونے چاہئیں!!

یہی تھے وہ شاستری جی، جن کی حکومت سے خود ہندوستان کے ہندو، تنگ آکر، چیخ اٹھے تھے کہ

شاستری حکومت ایک سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی جاتی

---

[1] یہی، تعلیم پاکستان میں مودودی صاحب دیتے ہیں۔

[2] شاستری، بہت بڑے عالم کو کہتے ہیں۔ جو شاستروں کا علم رکھتا ہو۔

ہے اور ہم فانی انسان اس کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔ حساس طبائع نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حکومت کا سربراہ ——— مسٹر شاستری ——— خود اس کامیں کا منجھا ہوا فن کار ہے۔

(نیوایج بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۱/۶۶ ۵۔ طلوع اسلام ستمبر ۱۹۶۶ء)

یہ ہے ہندو دھرم۔ اور یہ ہیں اس دھرم کے پجاری ——— کوٹلیا، سیاست کا امام۔ مہاتما گاندھی، ستیا کے اوتار۔ اور شاستری صاحب، اُس باپو کے نامور سپوت!

یہ ہے ہندو دیوتا کے مجسمہ کا ایک روپ۔ اب آگے بڑھئے۔

مذہب کے متعلق

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام کی رو سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے مذہب کی بنا پر (جسے دین کہا جاتا ہے) ایک الگ قوم ہیں۔ اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قوانین خداوندی نافذ کر سکیں۔ یہ دعوے مسلمانوں کا تھا جس کا تعلق ان کے "مذہب" سے تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی غیر مسلم کو دخل دینے کا حق ہی نہیں پہنچتا تھا لیکن دیکھئے کہ ہندوؤں کا اس باب میں ردعمل کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے آل انڈیا نیشنل کانگریس منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء کے خطبہ صدارت میں کہا کہ

> ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

(طلوع اسلام۔ بابت جون ۱۹۳۸ء)

یہ تو رہا دو قومی نظریہ کے متعلق۔ خود مذہب کے متعلق انہوں نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں لکھا:

> جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل (بیزار) ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا۔ بے دلیل عقیدت اور تعصب کا۔ توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی لعنت کا حامی ہے

(بحوالہ طلوع اسلام۔ جون ۱۹۳۸ء)

آپ کہیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، دہریہ تھے۔ اس لئے مذہب کے ——— متعلق ان کا یہ طرز عمل حق بجانب تھا۔ وہ سیکولر نظام کے حامی تھے ——— اس لئے ان کی اس مخالفت میں، اسلام کی خصوصیت

نہیں۔ وہ تمام مذاہب کے مخالف تھے۔ لیکن اوّل تو آپ نے اس اقتباس میں "منظم مذہب" کی تخصیص پر غور نہیں فرمایا ... ... منظم مذہب —— یعنی وہ مذہب جو مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ تنظیم کا حامی ہے (جسے قوم کہا جاتا ہے) ہندومت نہیں، اسلام ہے۔ دوسرے یہ کہ پنڈت جواہر لال ہندومت کو سرے سے مذہب ہی قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنی کتاب —— میری کہانی —— میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ہندومت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات و رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندومت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارو ک) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندومت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں۔ چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ جب پنڈت نہرو کے نزدیک، ہندومت کوئی مذہب ہی نہیں تھا تو اسے مٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو اسلام تھا جو ان کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور جسے وہ مٹانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کی تصریح، نہرو کے ہم مرتبہ ایک کانگریسی لیڈر مسٹر ولبھائی ڈیسائی نے ان الفاظ میں کر دی کہ:-

> اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کر لیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ضمیر، مذہب، اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رہنے دیا جائے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز ۵-۸-۴۳۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۴۳ء)

قرآنی حکومت کے خلاف

اور اگر آپ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو وہ بھی سن لیجئے۔ ۱۹۴۱ء میں "اکھنڈ ہندوستان کانفرنس" کا اجلاس لدھیانہ میں منعقد ہوا جس کی صدارت، مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ ہمیں اس کا علم ہے کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم کیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

> مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطۂ ارض ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے برداشت نہیں کر سکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کریں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد شمشیر و سناں کا نشانہ بنائے جائیں گے۔ ان کی عورتوں کی عصمت دری اور ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوگی۔

(بحوالہ طلوع اسلام - دسمبر ۱۹۴۱ء)

واضح رہے کہ یہ خیالات، ہندو قوم کے بازاری افراد کے نہیں تھے۔ یہ ان کے چوٹی کے لیڈروں کے خیالات اور عزائم تھے۔ اور ان کے بلند ترین اخبارات دن رات یہ کہتے رہتے تھے کہ

حکومت الٰہی کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۱۱/۳۹-۱۴ - بحوالہ طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۳۹ء)

لیکن تماشا یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں کے متعلق تو یہ کچھ کہا جا رہا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہا جاتا تھا کہ

ہندوستان کو نظریہ اور عمل دونوں لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیئے جس کا کلچر ہندو جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔

(طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۳۸ء)

یہ الفاظ ڈاکٹر رادھا مکرجی کے تھے جو ہندو مہا سبھا کے نائب صدر اور بنگال میں کانگریس پارلیمنٹ لیڈر تھے۔ یہ الفاظ انہوں نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس (لاہور) کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے۔

اور مسٹر ساورکر نے یہ کہہ کر سارا قضیہ ہی ختم کر دیا تھا کہ

"لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو۔ مثلاً کلچر۔ نسل اور روایات وغیرہ۔ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو"

(اسٹیٹسمین۔ ۲/۳۹-۲ - بحوالہ طلوع اسلام۔ اپریل ۱۹۳۹ء)

آپ غالباً متعجب ہوں گے کہ اس باب میں گاندھی جی کا "ذکر خیر" آیا ہی نہیں۔ کیا وہ خاموش بیٹھے تھے! جی نہیں۔ گاندھی جی ایسے اہم معاملہ میں خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ لیکن ان کا بات کرنے کا انداز اپنا تھا۔ سنئے کہ اس دوران میں وہ کیا کرتے اور کیا کہتے تھے۔

گاندھی جی کا اپدیش

مہاتما گاندھی نے، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائد اعظم کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباد اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعوےٰ کرے کہ وہ اپنے آباد اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان، اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک ہی قوم رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

پھر انہوں نے اپنے اخبار "ہریجن" کی، ۹ فروری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں لکھا۔

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے، میرے مذہب کی قسم میں اس کے لئے اپنی جان تک دیدیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ، مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔

آپ کہیں گے کہ گاندھی جی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے، اور سیکولر نظامِ حکومت کے قائل کو مذہب کے متعلق یہی عقیدہ رکھنا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا گاندھی جی واقعی سیکولر نظامِ حکومت کے قائل تھے؟ اس کا جواب، ہم سے نہیں، اس خط کے الفاظ سے لیجئے جو قائدِ اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کو یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (گاندھی جی سے) کہا تھا۔

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کے تعین میں مذہب کو کوئی دخل ہونا چاہیئے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کا زندگی میں مقصد کیا ہے آپ کے نزدیک وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے تو ہمیں کسی کام کے کرنے پر آمادہ کرتا ہے ـــ کیا وہ جذبہ، وہ مقصد، مذہبی ہے۔ یا معاشرتی یا سیاسی ـــ تو آپ نے کہا تھا کہ "خالص مذہبی"۔

یعنی اپنی سیاسی جدوجہد کا جذبۂ محرکہ خالص مذہبی، اور دوسروں کو تلقین کہ وہ مذہب کو سیاست میں دخیل کار نہ ہونے دیں۔ یہی تھی گاندھی صاحب کی وہ دورخی پالیسی جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را ۔۔۔ نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر ۔۔۔ بدوشِ خود برد زنارِ خود را

اور مسلمانوں کا یہ طعن کسی مفروضہ پر مبنی نہیں تھا۔ ایک حقیقت تھا۔ گاندھی جی اِدھر ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھو۔ اور اُدھر ہندوستان میں جس قسم کی سیاست کو رائج کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق، کانگریس کے جنرل سکریٹری، آچاریہ کرپلانی نے، اگست ۱۹۳۹ء میں، اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ

ہندوستان کی حکومت

گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دیدیں۔ بلکہ یہ سب سے ضروری چیز ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرہ میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے، ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

گاندھی جی کو سب سے بڑا ڈر یہ کھائے جا رہا تھا کہ مسلمان بچوں کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہوتا ہے کہ اسلام، باقی مذاہب کے مقابلہ میں افضل ہے۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمان بچوں کے دل سے اس خیال کو نکال دیا جائے تاکہ ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی عظمت و اہمیت کا احساس مٹ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے، بھارت کے موجودہ پردھان، ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے مشورہ اور تعاون سے، ہندوستانی بچوں کے لئے ایک مشترکہ تعلیم کی اسکیم مرتب کی (جو واردھا کی تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی)۔ اس اسکیم کا مقصد کیا تھا، اس کا اندازہ گاندھی جی کے اس وضاحتی بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو انہوں نے اس سلسلہ میں اخبارات کو دیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا،

واردھا اسکیم

> مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں، رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے میں، اس کے پیش نظر اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب، دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے۔ یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی مذہب سچا ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۷ ہہہ۔ بحوالہ طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۳۸ء)

(طلوع اسلام نے اس ملعون تعلیمی اسکیم کے خلاف کس قدر ملک گیر مہم چلائی اور کس طرح اسے، اور اس کے تحت مرتب کردہ نصاب کی کتابوں کو غرق سمندر کرایا گیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں)۔

لیکن جب، گاندھی جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کی ان تمام سازشوں اور روباہ بازیوں کے باوجود تحریک پاکستان آگے بڑھتی گئی حتیٰ کہ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں حصولِ پاکستان کا مشہور ریزولیشن پاس ہو گیا تو گاندھی جی

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت

کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ کھل کر سامنے آگئے۔ انہوں نے، اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنے ایک بیان میں کہا:

میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کچھ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آجکل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کردوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔

(بحوالہ طلوع اسلام۔ جون ۱۹۴۰ء)

پھر انہوں نے، اسی سلسلہ مضامین کی دوسری قسط میں (۱۴ اپریل ۱۹۴۰ء کو) لکھا۔

میری روح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندو مت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے..... میں اس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بھی بدل بیٹھیں۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے ۵ مئی ۱۹۴۰ء کو لکھا کہ

میں ایک تنگ نظر ہندو مت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ تہذیبیں اب ایک دوسرے میں مدغم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہو سکتیں۔ (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا۔ عزیزانِ من! کہ مسلمانوں کے متعلق، ہندوستان کے ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟

اکّال الامم

مولانا حالی نے بھارت کو "اکّال الامم" کہا ہے۔ یعنی وہ کالی دیوی جو ان تمام قوموں کو نگل گئی جو زمانہ قبل از تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک، باہر سے آئی تھیں۔ جب وہ قومیں ہندوستان میں آئی تھیں تو ان کا جداگانہ تشخص۔ جداگانہ قومیت۔ جداگانہ مذہب۔ جداگانہ تہذیب تھی، لیکن اس کے بعد دیکھئے کہ ان کے جداگانہ وجود کا نشان تک اس طرح مٹ گیا گویا وہ کبھی دنیا میں موجود ہی نہ تھیں۔ وہ سب ہندو بن گئیں۔ لیکن ان سب میں، مسلمان سخت ہڈی کے نکلے۔ یہ ہندوؤں کی تمام

چالوں کے باوجود، ان میں جذب نہ ہوئے اور ان کی یہی سخت جانی تھی جو ہندو کے لئے خارِ پہلو بن رہی تھی۔ یہاتما جی اور ان کے چیلوں کی، مسلمانوں کے غم میں، یہ تمام دردناک آہیں، اور جگر گداز فغانیں، اسی کانٹے کی کھٹک کا نتیجہ تھیں۔ پہلے انہیں یہ غم ستا رہا تھا کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندہ کیوں ہیں۔ اور اب یہ صدمہ مار رہا تھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ اُن کے بڑے بڑے یہاپُرش، اپنی جاتی کے سپوتوں سے للکار للکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھنا! یہ کہیں جانے نہ پائیں۔ سردار پٹیل نے مارچ ۱۹۴۷ء میں، احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا۔

> جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں ان میں سے نوّے فی صد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ اُن لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔ (طلوع اسلام۔ اپریل ۱۹۴۷ء)

یہ حضرات اس قسم کی تقاریر سے، ہندو سپوتوں کو مشتعل کر رہے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے مختلف مقامات

مسلمانوں کا قتلِ عام

پر مسلمانوں کو قتل و غارت کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں پر کس قدر تشدد کیا جاتا تھا، اس کی تفصیل طول طویل ہے (مسلم لیگ کی طرف سے متعین کردہ، پیر پور کمیٹی کی رپورٹ، اس پر شاہد تھی)۔ میں اس مقام پر صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا۔ ۱۹۴۰ء میں، سی۔ پی کے قصبہ چاند پور میں، ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کو بری طرح سے قتل کیا اور لوٹا۔ اور وہاں کی کانگریسی حکومت نے، خود مسلمانوں کو گرفتار کر کے انہیں جیل میں ٹھونس دیا۔ اس سلسلہ میں ان پر کس قدر تشدد کیا گیا اس کے متعلق، وہاں کے سیشن جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا۔

> تمام مسلمانوں کی ذلت کے ساتھ شہر کی سڑکوں پر تشہیر کی گئی۔ اور پھر اسکول کے ایک کمرے میں ۱۴۵ مسلمان بند کر دیئے گئے۔ یہ کمرہ تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ جس میں یہ مسلمان رات بھر مقفل رکھے گئے۔ ان لوگوں کی تشہیر کے لئے جب انہیں سڑکوں پر گھمایا گیا تو وہ دوپہر کا وقت تھا اور چونکہ یہ سخت ترین گرمی کا زمانہ تھا اس لئے اس وقت گرمی یقیناً بہت زیادہ ہو گی۔ جو مجسٹریٹ اس تشہیر کے وقت ساتھ تھا اس نے تسلیم کیا ہے کہ اس وقت اتنی شدید گرمی تھی کہ اس تشہیر میں کئی لوگوں کو قے آ گئی ...... حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ذلت کے ساتھ برسرِ عام گھما کر کے ان کی جانچ کرنے سے لے کر ۱۴۵ آدمیوں کو ان کے جیل بھیجنے کے وقت تک پولیس کا جو عمل رہا ہے اسے دیکھ کر آجکل کے نازی جرمنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

(مدینہ بجنور ۲۵ بحوالہ طلوع اسلام۔ ستمبر ۱۹۴۰ء)

یہ تھا کانگریس حکومت کے تحت، مسلمان اقلیت کا حشر!

کہا یہ جاتا ہے — اور خود اُس زمانے کے (مسلمان) غدارانِ ملت، جو حصولِ پاکستان کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل تھے، کہا کرتے تھے — کہ ہندو، وہاں اپنی حکومت قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خود مغربی جمہوریت ہی کس قدر ملعون و مردود نظامِ مملکت ہے۔ اگر مغربی زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، تو ہندوستان کی جمہوریت بھی نرالے قسم کی ہوتی — اور ہے — مغربی اندازِ جمہوریت میں، ہوتا یہ ہے کہ جو پارٹی آج اقلیت میں ہے، اس کے لئے امکان ہے کہ وہ کل کو اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کرلے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اور چونکہ یہ اقلیت مذہب کی بنیاد پر تھی، اس لئے اسکے لئے اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ یہ کبھی اکثریت بن کر اپنی حکومت قائم کرسکے۔ لہٰذا اسے مستقلاً ہندو اکثریت کی محکومی کی زندگی بسر کرنی پڑتی۔ ہندو کی محکومی کس قسم کی ہوتی، اس کا جواب ہم سے نہیں۔ خود وہاں کے اربابِ سیاست کی زبان سے سنئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس ضمن میں لکھا تھا کہ

جمہوری نظام

درحقیقت جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر، اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ (میری کہانی جلد دوم۔ صفحہ ۵۵)

اس اکثریت کی حکومت کے تابع مسلمانوں پر کیا گزرتی۔ اس کے متعلق، متحدہ قومیت کی سب سے بڑی مؤید جماعت — جمعیت العلمائے ہند — کے سکریٹری، مولانا احمد سعید (مرحوم) نے ۱۹۲۶ء میں کہا تھا کہ

اسلامی حکومت کے زوال پر اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو جاتی، تو مسلمانوں کو چھٹی کا کھایا یاد آجاتا — جو قوم موجودہ غلامی کی حالت میں یہ ستم ڈھا رہی ہے، حکمران بن کر خدا جانے مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتی۔ (الجمعیۃ - بابت ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء)

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا نام تو آپ نے سنا ہوگا — یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے نظریۂ قومیت کی بنا پر، علامہ اقبالؒ نے ان کے ماتھے پر وہ کلنک کا ٹیکہ لگایا تھا کہ اگر وہ اسے تسنیم و سلسبیل کے پانی سے بھی مل کر دھوتے رہیں گے، تو وہ نہیں اترے گا — انہی مدنی صاحب نے ۱۹۳۸ء میں، مولانا شوکت علی (مرحوم) کو ایک خط میں لکھا تھا۔

چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں۔ اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرماتے

ہیں کہ "یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے۔ یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے"! جو مظالم آئے دن دفتروں میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں۔ اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۴۲ء)

آسمان نے ایسا منظر بھی شاید ہی کبھی دیکھا ہو کہ جو لوگ چند سال پہلے ہندوؤں کی حکومت کے متعلق یہ کچھ کہہ رہے تھے، وہ خود اُنہی ملک میں، انہی ہندوؤں کی حکومت کے لئے مصروفِ جدوجہد ہو گئے اور جو مسلمان ان کے چنگل سے نکل کر اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے، ان کی سخت مخالفت کرنے لگے۔ لیکن یہ ایک جداگانہ کہانی ہے جسے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھئے کہ ہندو کیا ہے (انگریز

ہندوؤں کے عزائم

کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے، اس کا انکشاف قائد اعظم نے، دسمبر ۱۹۴۱ء میں، آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

ساورکر (صدر ہندو مہا سبھا) کی اسکیم یہ ہے کہ جب (انگریز کے جانے کے بعد) ہوائی۔ بحری۔ اور زمینی فوج میں ہندوؤں کو ۸۰ فی صد حصہ مل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں، ان کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ ہندو، جس کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے، ملتِ اسلامیہ کے محبوب راہنما

پاکستان بن جانے کے بعد

محمد علی جناح (رحمۃ اللہ علیہ) نے دس سال تک مسلسل لڑائی لڑی، اور ہندو اور انگریز کے علاوہ، خود نیشنلسٹ مسلمانوں — جمعیت العلماء — [illegible] سرحد کے سرخ پوش — مجلس احرار — نیز جماعت اسلامی — اور یونینسٹ پارٹی — کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم، پاکستان حاصل کر لیا۔ اس پر ان مخالفین کے دلوں کے اضطراب کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک طرف، ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی یہ کہہ رہا تھا کہ

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت

کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔　　(آرگنائزر - ۳ جولائی ۴۷ء)

دوسری طرف سے دیوان چمن لال جیسے (بظاہر اعتدال پسند ہندو) یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھا رہے تھے کہ

میں ناامید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دیدینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اپنی قوم کو امن اور شانتی کی لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوئے ہیں۔　　(ایضاً)

اور تو اور، جب تقسیم ہند کا بل، منظوری کے لئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیر اعظم، لارڈ ایٹلی (جو اس وقت مسٹر ایٹلی تھے) اپنی تقریر میں فرما رہے تھے کہ

ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔

پاکستان، انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس سمجھوتہ کے ایک فریق (انگریز) کے خیالات معلوم کر لئے۔ اب کانگریس کی سنئے۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا، اور ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

کانگریس کی طرف سے، تقسیم ہند کے فیصلہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ

ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کرے کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔　　(پاکستان فیسز انڈیا۔ صفحہ ۹۹)

اس کے بعد، راجہ مہندر پرتاپ نے (سنہ ۱۹۵۰ء) میں اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومت ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

(وبر بھارت۔ ۲۱ بیا)

سوشلسٹ اپنے آپ کو بڑا منصف مزاج اور تعصب سے بالاتر قرار دیا کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مخالفت کا تعلق ہے اس میں ہندو مہاسبھا اور سوشلسٹ پارٹی میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ اس پارٹی کے لیڈر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا تھا کہ

ہم زیادہ عرصہ تک انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ ہی میں امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حد فاصل مٹ جائے گی۔ ہمیں پاکستان کے اس زہر کو ختم کر کے تقسیم ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی اور پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ملک ہو جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اس انتظار میں ہوں گے کہ اس باب میں بڑے میاں نے کیا دیا کھیان دیا تھا۔ وہ بھی سن لیجئے۔ انہوں نے پاکستان بننے کے تیرہ دن پہلے کہا تھا کہ

اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے تو ہم پھر بھی مطالبہ پاکستان منظور نہیں کریں گے خواہ مسلمان اسے بزور شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔

(دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ صفحہ ۴۶۱ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لوبی)

یہ اس داستان کا پہلا باب ہے۔ اب دوسرا باب ملاحظہ فرمایئے کہ تشکیل پاکستان کے بعد، ہندو کس روپ میں سامنے آیا۔ اس روپ کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندو نے خود اپنے ہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا۔ اور دوسرے یہ کہ پاکستان کی طرف آنے والے مسلمانوں کو کس طرح اپنی ہوس خون آشامی کی تسکین کا سامان بنایا۔

باب دوم

(تشکیل پاکستان کے بعد)

(۱) وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا۔

ہندوؤں نے اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد، پہلا کام یہ کیا کہ سومنات کی جامع مسجد کو، جو ایک ہزار سال سے وہاں ایستادہ تھی، مسمار کر کے اس کی جگہ مندر بنا دیا۔ یہ تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی گئی اور اس "مقدس رسم" کی ادائیگی کے لئے، سیکولر حکومت کے صدر، بابو راجندر پرشاد کو بلایا گیا[1]۔ اس کے بعد جو وہاں مسجدیں ڈھانے کی طرح پڑی ہے تو پھر ایسے واقعات کا کوئی انت شمار ہی نہیں رہا۔ حالانکہ تقسیم ملک سے متعلق آئین میں اقلیتوں کے مذہب اور ثقافت کی حفاظت دی گئی تھی۔ اخبار مدینہ کی ۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق، ایک شہر لدھیانہ کی ۱۱۷ مساجد میں سے ۹۰ میں گردوارے بن چکے ہیں۔ ۱۵ میں مندر۔ اور باقیوں میں رہائش ہے۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۶۶ء)

اسلامک کلچر کا خاتمہ

جہاں تک ثقافت کا تعلق ہے، ہندوستان کے پہلے جشن آزادی کی تقریب پر، یو پی کانگریس کمیٹی کے صدر اور وہاں کی اسمبلی کے سپیکر، مسٹر ٹنڈن نے پورے جوش و خروش سے کہا کہ:

> ہندوستان یونین میں، جداگانہ زبان اور جداگانہ کلچر کی آواز کہیں سے نہیں نکلنی چاہیئے۔ جو لوگ کسی خاص فرقے کے لئے جداگانہ زبان یا کلچر کی حمایت کرتے ہوں ان کے لئے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنا نظریہ نہ بدل سکیں تو انہیں ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیئے۔ مذہب اور کلچر دو مختلف چیزیں ہیں۔ چین جاپان اور دیگر ممالک میں بھی مسلمان بستے ہیں نہ ان کی جداگانہ زبان ہے نہ جداگانہ کلچر۔ ان کا کلچر وہی ہے جو ان کی مادر وطن کا کلچر ہے۔ اگر مسلمان ہندوستان میں رہنے کے خواہشمند ہیں تو انہیں ہندی کو بطور زبان اور ناگری کو بطور رسم الخط اختیار کرنا ہوگا۔ انہیں اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے عرب یا پاکستان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ بھارت ورش کے کلچر کو اپنا کلچر بنانا چاہیئے۔

(ہندوستان ٹائمز ۱۶ ستمبر)

سی پی کے وزیر اعظم، مسٹر شکلا نے بھی یہی کچھ فرمایا اور کہا کہ

> میں، ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں ابھی تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے، یہ چیلنج دینا

---

[1] آپ کو معلوم ہے کہ ہم (پاکستان کے مسلمانوں) نے اس کا جواب کیسے دیا تھا؟ یہ تقریب ۱۱ مئی کو منعقد ہوئی تھی۔ یہاں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ۱۱ مئی کو قوم میں جس قدر لڑکے پیدا ہوں ان کا نام محمود رکھا جائے۔ چنانچہ ایسا کرنے کے بعد ہم خوش ہو گئے کہ ہماری قوم میں اتنے محمود پیدا ہو گئے ہیں! کس قدر خود فریب واقع ہوئی ہے یہ قوم!!

چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ ہی کامیاب ہونے دیں گے۔ (ملاپ ۱۲/۱۲ ۴۸)

اور انڈین پارلیمنٹ کے اسپیکر، مسٹر مولنکر نے ایک جلسہ میں کہا کہ

ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدن کو تباہ ہو جانا چاہیئے..... اقلیت کے فرقہ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

(الجمعیتہ۔ دہلی۔ بحوالہ طلوع اسلام۔ بابت فروری ۱۹۴۹ء)

جب مسلمانوں نے ہندوؤں کے معتدل مزاج لیڈروں کی توجہ ان تقاریر کی طرف دلائی تو پنڈت سندر لال جیسے لیڈر نے، جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو ایک طرح کا مسلمان کہا کرتے ہیں، جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے کہا کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوتی ہے، تو انہیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنہوں نے پاکستان بنوایا تھا آخر منتیں ہیں سے وہ لوگ تھے جو " لے کے رہیں گے پاکستان" اور " بٹ کے رہے گا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ (صدق ۱۷/۱۲ ۴۸)

یہ ۱۹۴۸ء کی باتیں تھیں۔ اور ۱۹۲۶ء میں، ہندو مہاسبھا نے الیکشن کے سلسلہ میں جو اپنا منشور شائع کیا اس میں واضح الفاظ میں لکھا کہ

مہاسبھا دستور میں اس قسم کی ترمیمات کے حق میں ہے جو ہندو کلچر کی روایات کے مطابق ہوں اور جس کے نتیجے میں ملک صحیح معنوں میں ایک جمہوری ہندو ریاست بن سکے۔ اگرچہ اقلیتیں کلچر اور مذہب کے معاملہ میں آزاد ہوں گی لیکن انہیں ہند قومیت کے خاص دھارے میں سمو جانا چاہیئے اور مذہب اور کلچر کے نام پر علیحدہ قومیت کے تصور کو خیرباد کہدینا چاہیئے۔

(" مدینہ بجنور" ۲۵/۹/۴۶)

ان دھمکیوں پر وہاں عمل کس طرح ہو رہا ہے، اس کا اندازہ ایک نہایت دلچسپ واقعہ سے لگایئے جو الہ آباد کے ایک مشہور شاعر اور افسانہ نگار ہندو کے ساتھ حال ہی میں پیش آیا اور جسے انہوں نے ایک خط میں بیان کیا جو لکھنؤ کے اخبار صدق میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس میں لکھا تھا۔

میں ڈاڑھی رکھتا ہوں اور ویسے بھی چہرہ ترکی چہرہ ہے۔ بالکل اس ترک کی طرح جو ہزاروں سال سے گھس کر اور غریبی بھگت کر چھوٹا پڑ گیا ہو۔ پھر میں گرمیوں میں علی گڑھ پاجامہ اور کرتا بھی پہنتا ہوں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان فرقہ وارانہ فسادات میں (جو ان دنوں الٰہ آباد میں ہو رہے تھے) مجھے کیا سمجھا جاتا ہوگا ——— اہل مسلمان، بلکہ مسلمٹا ——— ایک دن سات بجے میں کچھ کتابیں اور فائلیں لئے پیدل جا رہا تھا کہ اچانک میرے دونوں جانب کچھ لوگ سائیکل سے اترے اور ایک نے چھرا نکال لیا۔ میں نے چلا کر کہا کہ میں ہندو ہوں۔ بس وہ چلانا کام آگیا اور خوش قسمتی سے میں زندہ ہوں۔ پھر انہوں نے میرے ساتھ یہ مسخرا پن کیا کہ مجھے قریب کی نائی کی دکان پر لے گئے اور میری برسوں کی محفوظ ڈاڑھی کٹوا دی۔ انہیں کسی مسلمٹے پر ہاتھ صاف کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

(طلوع اسلام۔ جون ۱۹۶۸ء)

یہ کچھ وہاں موجودہ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جہاں تک وہاں کے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کا تعلق ہے، ان کے لئے نظام تعلیم ایسا وضع کر دیا گیا ہے کہ جس سے وہ بھول جائیں کہ وہ کسی جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ (یہی گاندھی جی کی وارد ھا کی تعلیمی اسکیم کا مقصد تھا)۔ اس سلسلہ میں کوئی دو سال اُدھر مولانا ابوالحسن ندوی نے، ہندوستان میں رہنے والے اپنے ایمانی بھائیوں کے نام ایک اپیل میں کہا تھا کہ

دل پر پتھر رکھ کر لیکن آنکھوں کی پٹی کھول کر یہ بات عرض کرنی پڑتی ہے کہ اب اس بات کے سمجھنے میں کسی دور بینی یا فراست ایمانی کی ضرورت نہیں کہ سرکاری اسکولوں میں جو نصاب (بالخصوص ہندی اور سنسکرت میں پڑھایا جاتا ہے) اس کے بعد کسی مسلمان بچے کا، کم سے کم معنی میں بھی مسلمان رہنا عقلاً اسی طرح ممکن نہیں جیسے دریا میں کودنے اور غوطہ لگانے کے بعد جسم کا خشک رہنا اور دامن کا تر نہ ہونا، ممکن نہیں۔ (طلوع اسلام۔ نومبر ۱۹۶۶ء)

فسادات

یہ کچھ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ ذہنی اور نفسیاتی طور پر کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ وہاں متواتر بیس سال سے جو فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور جن میں، مسلمانوں کی جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو۔ عصمت کچھ بھی محفوظ نہیں رہتی، ان کا عدد شمار ہی نہیں۔ سید بدرالدجیٰ مغربی بنگال کے ایک مسلم راہنما ہیں۔ بہت پرانے کانگریسی۔ آزادی کی جنگ میں ہندوؤں کے چوٹی کے لیڈروں کے ہمراہ، شانہ بشانہ لڑنے اور جیل جانے والے۔ اس وقت وہ وہاں کی مرکزی پارلیمان کے رکن ہیں۔ انہوں نے، کوئی دو سال اُدھر، پارلیمان کے بھرے اجلاس میں ایک طول طویل تقریر میں تفصیل سے بتایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کو حاصل کئے انیس سال ہوتے ہیں۔ ان انیس سالوں میں (مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے) پولیس کی بے امتیاز فائرنگ (انگریزوں

کی ڈیڑھ سوسالہ روایات کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری جھوٹی یقین دہانیاں۔ لوٹ مار کے دل دوز مناظر۔ ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام۔ بلا کسی امتیاز کے لاکھوں کی گرفتاری۔ آسام اور مغربی بنگال سے بے دخلیاں۔ اور اس قسم کے دوسرے ہزارہا واقعات مسلمانوں سے موجودہ سیکولر حکومت کے "جانبدارانہ" سلوک کے ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں انکشاف کیا کہ پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران، پچاس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان کا جاسوس قرار دے کر غداری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مغربی بنگال میں ۴۵ ہزار پاکستانی موجود تھے۔ ان میں سے دس ہزار نظر بند کر دیئے گئے جو مسلمان تھے۔ ہندوؤں کو پاکستانی ہونے کے باوجود کچھ نہیں کہا گیا۔ (طلوع اسلام - جولائی - ۱۹۶۶ء)

جہانتک فسادات کا تعلق ہے، ان کی کیفیت بڑی دل دوز اور جگر سوز ہے۔ کلکتہ سے شائع ہونیوالے اخبار (NOW) کی ۱۲ر جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں منجملہ دیگر امور کہا گیا تھا:

> تقسیم ہند کے بعد کم از کم پانچسو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں جن میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زائد ہے لیکن یہ تخمینہ بہت پرانا ہے اور نظر ثانی کا محتاج، یہ تمام فسادات سیکولرازم کے پردے میں ہوئے ہیں اور یہ سیکولرازم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس برہمن ذہنیت کی حفاظت کی جائے جس کی نمایندگی جن سنگھ اور آر۔ ایس۔ ایس۔ جیسی فاشسٹ جماعتیں کر رہی ہیں۔ ظاہر میں جن سنگھ فساد کراتی ہے لیکن پس پردہ اس کو کانگریس کی پوری تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مسٹر نرادسی۔ چودھری لکھتا ہے کہ "واقعہ یہ ہے کہ ہندو روایت جس قدر متشدد آج ہے اتنی آزادی کے وقت نہ تھی۔ اور جیسے جیسے وقت گذر رہا ہے اس میں مسلمانوں کے بارے میں، اور بھی زیادہ شدت آرہی ہے۔ (بحوالہ ایشیا ۲۱ ۶۸/۷)

حال ہی میں بھارت کے وزیر داخلہ نے اپنی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں جو فسادات ہوئے ہیں، ان کی تعداد ۱۹۶۶ء میں (۱۳۳) اور ۱۹۶۷ء میں (۲۶۷) تھی۔ ۱۹۶۸ء میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کے صرف چار ماہ میں مسلمانوں کے خلاف (۳۰۰) فسادات ہو چکے تھے۔ خونریزی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۶۶-۱۹۶۵ء تک مقتولین کی تعداد کا جو اوسط تھا۔ ۱۹۶۷ء کے صرف پہلے ۹ ماہ میں مقتولوں کی تعداد اس سے دگنی ہو چکی تھی۔ (بحوالہ ایشیا ۲۱ ۶۸/۷)

مسلمانوں کے خلاف ان تمام ذہنی اور نفسیاتی دھمکیوں اور اس قسم کی خونریزیوں اور غارت گریوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کے مسلمان سخت مرعوب اور (DEMORALISED) ہو گئے ہیں اور وہ ہندوؤں کے

سامنے اس قدر جھکنے اور ان کی اس درجہ خوشامد کرنے لگ گئے ہیں کہ رفتہ رفتہ ان سے ملی غیرت اور انسانی حمیت رخصت ہوتی چلی جارہی ہے۔ مثلاً ابھی ہندو حکومت کو قائم ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ مہاتما گاندھی کی وفات ہوگئی۔ اس پر (۵ر فروری ۱۹۴۸ء کے) ہندوستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی کہ

> دھلی کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ مہاتما گاندھی کے شایان شان ایک یادگار قائم کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی مقدس راکھ میں سے کچھ انہیں بھی دی جائے۔ وہ اس راکھ پر دہلی کی جامع مسجد کے قریب، مقبرہ بنائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ۱۲ر فروری کو اس راکھ کا جلوس نکالیں گے اور اسے شہر سے بھر کے مزار کے قریب (جامع مسجد کے سامنے) دفن کریں گے۔

(بحوالہ طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۴۸ء)

ایک صاحب (عبد الرحمان خان) نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کے ہندوستان ٹائمز میں لکھا تھا۔

> اگر میں یہ عقیدہ نہ رکھتا کہ نبوت حضرت محمد رسول اللہ کے ساتھ ختم ہوگئی ہے تو میں یقیناً مہاتما گاندھی کو بیسویں صدی کا پیغمبر کہتا۔ (ایضاً)

اور میر مشتاق احمد صاحب، ایک قدم اور بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ

> گاندھی جی کی عظمت مکان و زمان سے بالاتر ہے۔ یہ محبت اور سلامتی کا پیغمبر اپنی عظمت میں، بدھ، عیسیٰ اور محمد سے بھی بڑھ گیا ہے۔ (معاذ اللہ) (ہندوستان ٹائمز ۱۸ ۲/۴۸)

اس کے چند ماہ بعد ایک صاحب، مسٹر ایم۔ انیس۔ ایچ۔ قریشی کا جریدہ اسٹیٹسمین میں ایک خط شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا۔

> ہندوستان سے، ہندو اور مسلمان قسم کے الفاظ یکسر نابود کر دینے چاہئیں۔ یہ تفریق ترقی کی راہ میں سنگ گراں ہے۔ جونہی ہم نے محسوس کر لیا کہ ہم فقط ہندوستانی ہیں، موجودہ تصادم کی جگہ خیر سگالی اور خوش حالی آجائے گی۔ (طلوع اسلام۔ بابت فروری ۱۹۴۹ء)

وہاں کی دستور ساز اسمبلی کے ۱۹۴۸ء کے سرمائی سیشن میں، ایک ممبر مسٹر تجمل حسین نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ اس ملک میں کوئی شخص نہ ایسا لباس پہنے نہ ایسا نام رکھے۔ نہ ایسی وضع قطع اختیار کرے جس سے اس کے مذہب کا پتہ چل سکے۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۴۹ء)

مسلمانوں کی مرعوبیت

یہ کچھ تو ایک سال کے اندر ہوا۔ اور اس کے سترہ سال بعد حالت کہاں تک پہنچی، اس کا اندازہ، وہاں کے ایک ہندو صحافی، مسٹر نیرد۔سی۔ چودھری، کے ایک مضمون سے لگائیے جو انہوں نے (رام لیلا کے تہوار کے سلسلہ میں) ۹ر دسمبر ۱۹۶۶ء کے اخبار

(NOW) میں لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے یہ کہا کہ ہندوستان کی حکومت اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہے لیکن حالت یہ ہے کہ اس حکومت کی سب سے بڑی نمائندہ، مسز اندرا گاندھی، رام لیلا کے تیوہار میں شرکت کرتی ہیں اور وہ تمام رسوم ادا کرتی ہیں جو ہندو دھرم کا جزو ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ

اس سے کہیں زیادہ تعجب انگیز واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں بھارت کے نائب صدر، ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب، رام لیلا گراؤنڈ (دھلی) میں تشریف لائے اور انہوں نے اس تقریب کا افتتاح کیا۔ میں نے یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محوِ حیرت رہ گیا۔ اس لئے کہ ہم ہندو، رام کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر چودھری نے لکھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خان کو اس کا علم ہونا چاہیئے تھا کہ رام لیلا کے تیوہار میں شرکت سے وہ شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں جو اسلام کی رو سے گناہ عظیم ہے اور احادیثِ نبوی نے اس کی سخت مذمت کی ہے اور اس سے ایک مسلمان اس توحید کے مقام بلند سے گر جاتا ہے جو نہایت پاکیزہ تصور ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں تو انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن اگر وہ اسلام کے پیرو نہیں رہے تو وہ شرک کے الزام سے تو بچ جائیں گے لیکن پھر ہندوؤں کے اس دعوے کی حقیقت کیا رہے گی کہ دیکھو! ہم نے ایک مسلمان کو اپنی مملکت کا نائب صدر بنایا ہے۔

اس کے بعد، مسٹر چودھری نے، مسلمانوں کے منہ پر اس زور سے ایک چپت لگایا کہ اس کی آواز آج تک فضا میں گونج رہی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

میں ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے کہوں گا کہ بھارت کے نائب صدر ہونے کی جہت سے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان پر معاشرتی سیاسی یا اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کسی طرح بھی لازم نہیں آتا تھا کہ وہ رام لیلا کے خالصتہً ہندوانہ تیوہار میں اس طرح شریک ہوں۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں تقریباً پندرہ یا سولہ برس کا تھا جب میں نے بت پرستی کے عقیدہ کو خیر باد کہا۔ اس کے بعد میں نے کسی مندر میں جھانک کر نہیں دیکھا۔

(طلوع اسلام - فروری ۱۹۶۶ء)

ان واقعات کو سن کر آپ ماتھے پر بل نہ ڈال لیجئے کہ ہندوستان کا مسلمان بڑا بے غیرت ہے۔ کیا معلوم کہ ہم وہاں ہوتے تو ہماری کیفیت کیا ہوتی ـــــ سوچیئے کہ ہندو کی تنگ نظری، کمینگی اور ہوسِ انتقام نے، ایک طرف مسلسل اعصابی جنگ اور دوسری طرف قتل و غارت گری سے، مسلمانوں کی حالت کیا کر دی ہے؟ پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ جمہوریت میں اقلیتوں کو ڈرا کر، دھمکا کر اپنی گرفت میں رکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ڈرا کر دھمکا کر، مسلمانوں کو اپنی گرفت ہی میں نہیں رکھا بلکہ استبداد کے آہنی شکنجہ میں جکڑ کر ان کی

ہڈیاں توڑ دی ہیں۔

اب آپ دہشت اور وحشت کے اس لرزہ انگیز منظر کا دوسرا سین دیکھئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء (بروز جمعۃ الوداع) ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ مملکتوں کا وجود عمل میں آیا اور اس کے دو روز بعد مسلمانوں نے آزادی کی فضا میں پہلی عید منائی۔ لیکن ہنوز نماز عید کی تکبیریں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں ـــــ نابھہ۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ۔ فرید کوٹ سے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتل عام کی خبریں آنی شروع ہو گئیں۔

مسلمانوں کا قتل عام

اس قتل و غارت گری میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ بچوں کو سنگینوں کی نوک پر اچھالا گیا۔ عصمت دری کے واقعات عام ہونے لگے۔ بعض شہروں میں مردوں کو ختم کر کے، نوجوان عورتوں کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ چند ہی ہفتوں کے اندر اندر تقریباً پانچ لاکھ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت گری کی اس آگ کا رخ دہلی کی طرف پھرا اور ہندوستان کے دارالسلطنت میں پورا مہینہ اس قسم کے قتل عام میں گذرا جس کی مثال تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ ایک اندازہ کے مطابق اس خونی تماشا میں، جو بھارت میں قریب دس لاکھ مسلمان قتل و غارت گری کی نذر ہو گئے۔ اور قریب ایک کروڑ مسلمان، انتہائی کس مپرسی کے عالم میں، کسی نہ کسی طرح جان بچا کر پاکستان پہنچ پائے۔ ان تارکین وطن کے ساتھ راستے میں کیا گذری اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ نومبر ۱۹۴۷ء میں، ضلع انبالہ کے کرنال کیمپ سے پانچ ہزار پناہ گزینوں کا قافلہ لائل پور کے قریب پہنچا۔ ان میں سے دو ہزار مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ ان میں پیچش کا مرض عام تھا۔ اس کیمپ میں انہیں جو آٹا کھانے کو دیا جاتا تھا جب اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا گیا تو اس میں نیلا تھوتھا کا زہر ملا ہوا تھا۔ ایک گاڑی ۱۱ نومبر کو دہلی سے لاہور پہنچی تو اس میں سفر کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں نے بتایا کہ حکومت ہند نے جو سپاہی ان کی حفاظت کے لئے گاڑی کے ساتھ متعین کئے تھے، انہوں نے کس طرح راستے میں ان کی عصمت دری کی۔ ایک ٹرین میں قریب ڈیڑھ ہزار پناہ گزین دہلی سے آ رہے تھے۔ امرتسر کے قریب ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہندوستان میں یا ہندوستانی حکومت کی طرف سے وہاں سے آنے والے مسلمانوں کے خلاف ہو رہا تھا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ہندوؤں کی طرف سے کیا واویلا مچایا جا رہا تھا۔ ان کی طرف سے مسلسل چیخ و پکار ہو رہی تھی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ان کے گھر لوٹ لئے ہیں۔ ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واویلا جس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، مہاتما گاندھی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کی اپنی شام کی پرارتھنا

کی میٹنگ میں کہا تھا کہ

> اگرچہ میں نے جنگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے لیکن اگر اس سلسلہ میں پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریق کارگر نہ ہوا تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ ہندوستان، پاکستان کے خلاف جنگ کرے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے بھی اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ "میں چاہتا تھا کہ اپنی فوجیں پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجدوں لیکن ہندوستان کے اندرونی خلفشار نے اس کی اجازت نہ دی"۔

یہ تھا ہندو لیڈروں کی طرف سے، مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے والے قیامت خیز واقعات کا جواب! خدا خدا کر کے، کسی نہ کسی طرح یہ آگ فرو ہوئی تو ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات شروع کرا دیئے گئے جس کے نتیجہ میں، قریب ڈیڑھ لاکھ مسلمان، اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر، نہایت کس مپرسی کی حالت میں، مشرقی بنگال کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہ تو رہیں قتل و غارت گری کی دہشت سامانیاں۔ اب بٹوارے کی طرف آیئے۔ تقسیم کے معاہدہ کی

ترکہ کی تقسیم

رو سے، ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ٹن فوجی سامان پاکستان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس میں سے ہندوستان نے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک صرف (۴۷۰۳) ٹن سامان پاکستان کو دیا۔ باقی سب خود ہڑپ کر گیا۔ تقسیم کے وقت، چار ارب روپیہ نقد ہندوستان میں موجود تھا جس میں سے ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصہ میں آتا تھا۔ ہندوستان نے اس رقم کے دینے سے بھی انکار کر دیا اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں بمشکل اس پر رضامند ہوا کہ پاکستان کو (۷۵) کروڑ روپیہ دیا جائے۔ اس میں سے بیس کروڑ روپیہ، پاکستان کو پہلے مل چکا تھا۔ ہندوستان بقایا ۵۵ کروڑ دبا کر بیٹھ گیا۔ اس کے لئے پاکستان کو ہزار جتن کرنے پڑے۔ اور جب بین الاقوامی دباؤ کے ماتحت، ہندوستان کو یہ روپیہ ادا کرنا پڑا تو اس میں سے بھی پانچ کروڑ روپیہ ڈنڈی مار کر رکھ لیا جو آج تک نہیں دیا۔ جس زمانے میں، ہندوستان، پاکستان کے حصہ کا روپیہ دبا کر بیٹھا ہوا تھا، ہندوستان کے حصہ کے توپ سے جنگی ہوائی جہاز پاکستان میں پڑے ہوئے تھے۔ پاکستان نے توپ کے توپ، بحفاظت ان کے حوالے کر دیئے۔

لیکن کمینہ فطرت ہند کی آتش انتقام اس سے فرو تھوڑے ہو سکتی تھی۔ وہ تو پاکستان کو سرے سے ختم کر دینے کی فکر میں تھا۔ تقسیم کے بعد، پاکستان جس حالت میں تھا، اور ہندوستان اسے کمزور سے کمزور تر

جنگ کی تیاریاں

کرنے کے لئے جو کچھ کر رہا تھا، اسے پیش نظر رکھئے، اور اس کے بعد وہاں کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن کا یہ انکشاف ملاحظہ فرمایئے کہ ہندوستان نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیش نظر اس فیصلہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ جب ۱۹۵۰ء میں بنگال میں فسادات کرائے گئے تو اس کے ساتھ ہی وہاں پاکستان پر فوجی حملہ کرنے کی ایک تحریک چلائی گئی جس کی تائید وہاں کے بڑے بڑے لیڈروں — مثل پنڈت نہرو — جے پرکاش نرائن۔ آر۔ کے چودھری وغیرہ سب نے کی۔ وزیر اعظم پاکستان:۔ نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے صلح کا ہاتھ بڑھایا لیکن پنڈت نہرو نے اس پیش کش کو نہایت بے اعتنائی سے ٹھکرا دیا۔ ابتدائے ۱۹۶۵ء میں، ہندوستان نے "رن اوف کچھ" میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو وہاں کے ہوم منسٹر نندا نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ ہم نے پوری آٹھ لاکھ فوج کو تیاری کا حکم دیدیا ہے، اور وزیر اعظم نے یہ کہہ کر اس کی تائید کی کہ آج ہندوستان کی پینتالیس کروڑ آبادی، ہر قربانی کے لئے تیار کھڑی ہے، ادھر رن اوف کچھ کے علاقہ میں یہ ہو رہا تھا، اور اُدھر بنگال میں انہوں نے پاکستانی علاقہ، واہا گرام پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا — اور پھر ستمبر ۱۹۶۵ء میں جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ واقعہ تو ہماری موجودہ نسل کی آنکھوں کے سامنے ظہور میں آیا تھا۔

میں نے عزیزانِ من! اس سلسلہ میں مسئلہ کشمیر کا ذکر قصداً نہیں چھیڑا کیونکہ وہ ہندو ذہنیت کی فی ذاتہٖ مکمل تصویر ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ لیکن میں اس ضمن میں، کم از کم ایک مثال ضرور پیش کروں گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندو کس قدر کمینہ فطرت واقع ہوا ہے۔ کوئی دو سال ادھر کا ذکر ہے کہ جمعیت العلماء ہند کے ناظم عمومی، (اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے صاحبزادہ) مولانا سید اسعد مدنی نے اپنا ایک خط اخبارات میں شائع کیا تھا جو انہوں نے کسی وقت لال بہادر شاستری کو لکھا تھا۔ اس خط میں انہوں نے شاستری صاحب سے کہا تھا۔

> میں نے اخبارات میں شائع شدہ آپ کی ایک تقریر پڑھی جس میں آپ نے این۔ سی۔ سی کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پاکستان جو ہمیشہ اسلام کی اصطلاح میں سوچتا ہے اس دھوکے میں ہے کہ وہ کشمیر کو اس لئے ہڑپ کر لے گا کہ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ پاکستان کی خام خیالی ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ اگر پاکستان یہ سوچتا ہے کہ وہ مسلم اکثریت کے بل پر کشمیر کو لے سکتا ہے تو اسے اچھی طرح سوچ رکھنا چاہیئے کہ اس صورت میں ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ (ماہنامہ تذکرہ دیوبند بابت دسمبر ۱۹۶۵ء بحوالہ طلوع اسلام جون ۱۹۶۶ء)۔

آپ سوچیے، برادران گرامی قدر! کہ کیا دنیا میں کمینگی اور بدفطرتی کی اس سے بدتر مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟

یہ ہے میری قوم کے نونہالو! ہندو دیوتا کے روپ کی ایک جھلک۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ ہمیں کس قسم کے ہمسایہ سے واسطہ پڑا ہے۔ اور اس کے بعد آپ سوچیے کہ کیا ہم ایک سیکنڈ کے لئے بھی اپنے دل میں خیال کر سکتے ہیں کہ اس ہمسایہ کے ہاتھوں ہمارا کچھ بھی محفوظ ہے؟ اگر کوئی شخص ایسا خیال کرتا ہے تو وہ فریبِ نفس کا شکار ہے۔ مسلمان کے خلاف ہندو کی دشمنی ازلی ہے اور یہ ابد تک اسی طرح رہے گی۔ اگر آپ کو اس کا مزید ثبوت درکار ہو تو آپ اُس زمانے کے ہندوستان کے) وزیر دفاع مسٹر چون کا وہ بیان پڑھیے جو اس نے، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست کھانے کے بعد، دیا تھا۔ اس بیان میں اس نے کہا تھا کہ

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آیڈیالوجی کا اختلاف ہے اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتہ بھر کی نہیں۔ بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔
>
> (طلوع اسلام - فروری ۱۹۶۶ء)

مسٹر چون نے یہ بیان اس وقت دیا تھا جب وہاں کے وزیراعظم، معاہدۂ تاشقند پر دستخط ثبت فرما رہے تھے۔ ایسے کھلے ہوئے دشمن سے اپنے آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی محفوظ سمجھنا انتہائی خود فریبی ہے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے قوم کو ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت ہے کہ

جہاں باز رہتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

یہی ہے وہ دشمن جس کے متعلق قرآن کریم نے ہم سے تاکیداً کہا تھا کہ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا یَأْلُونَكُمْ خَبَالًا اے جماعتِ مومنین! دیکھنا۔ اپنوں کے سوا کسی کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنانا۔ وہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ جس بات سے تمہیں نقصان پہنچے اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ تمہارے خلاف جو کچھ وہ سوچتے رہتے ہیں، اس میں سے یونہی کوئی بات ان کے مُنہ سے نکل جاتی ہے تو تمہیں کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے سینے میں مخفی ہوتا

ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ (۳/۱۱۷)۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے کیا کیا جائے۔ سو اس کے لئے ایک تو قرآن نے یہ تدبیر بتائی ہے

اس کا علاج کیا ہے؟

کہ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (۸/۶۰)۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو۔ لیکن یہ اس تدبیر کا صرف خارجی پہلو ہے۔ اس خطرہ سے حفاظت کا حقیقی علاج اور ہے اسے قرآن نے ان چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا (۳/۱۲۰)۔ اگر تم ثابت قدم رہے اور اپنا نظامِ معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کر لیا، تو ان کی خفیہ تدبیریں اور سازشیں تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گی۔

بس یہ ہے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کا صحیح، قابلِ اعتماد، اور یقینی علاج۔ یعنی نظامِ معاشرہ کی قوانینِ خداوندی کے مطابق تشکیل۔ یہی وہ نظام ہے جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب نہیں کر سکتا۔ جس میں ہر شخص کو بلا دقت و بلا مشقت انصاف ملتا ہے۔ جس میں ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں عزت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ جس میں عورت اور مرد، دونوں یکساں حقوق کے مالک ہوتے ہیں۔ جس میں کوئی انسان، اپنے آپ کو، سوائے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے، کسی کا محکوم و محتاج نہیں پاتا۔ یہی ہے وہ نظام جس میں تمام افرادِ ملت، دل کے پورے سکون اور ذہن کے کامل اطمینان کے ساتھ، ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت، تیار اور مستعد رہتے ہیں اور اس کے لئے جان تک دیدینے میں، حیاتِ ابدی کا سرور پاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ افراد، جن کا عزم و استقلال، تعداد کی قلت اور سامانِ حرب و ضرب کی کمی کو اس طرح پورا کر دیتا ہے کہ ان میں کا ایک ایک فرد، دشمن کے دس دس پر بھاری ہوتا ہے۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق کہا کہ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ (۲/۱۵۷)۔ ان پر خود خدا اسلام و رحمت کے پھول برساتا ہے۔

اس کے سوا عزیزانِ من! ہندو کے مستقل خطرہ سے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ شَهِيْدٌ۔

والسلام

قرآنی دعوتِ فکر کے حقیقت آفریں شاہکار

۱۔ لُغات القرآن یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے؟ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے، یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچاس روپے ہیں۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟ یہ مسئلے مسائل کی کتاب نہیں، یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں، وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت (قسم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ جیب ایڈیشن۔ چار روپے۔

۳۔ سلیم کے نام سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے مُلّا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اسکے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول۔ آٹھ روپے حصہ دوم و سوم۔ چھ، چھ روپے۔

۴۔ نظام ربوبیت نظام سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے! اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت۔ چار روپے۔

۵۔ خدا اور سرمایہ دار موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصر معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ قیمت قسم اعلیٰ مجلد، نو روپے۔ قسم دوم پانچ روپے۔

۶۔ سلسبیل قرآنی بصیرت کا چشمہ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت۔ آٹھ روپے۔

۷۔ بہارِ نو یہ مقالات کے مجموعہ کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت۔ پانچ روپے۔

۸۔ اسباب زوال امت مُلّا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اسلئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے۔ اسے معلوم کرنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت۔ ڈیڑھ روپے

۹- اسلامی معاشرت اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ انداز بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے۔

۱۰- قرآنی فیصلے زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اول ۳/۷۵ روپے جلد دوم ۳/۷۵ روپے جلد سوم ۲/- روپے

۱۱- قرآنی قوانین ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلاء حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ قیمت ۳/- روپے۔

۱۲- مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں تمام مذاہب عالم کی مقدس آسمانی کتابوں کی کہانی۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں کن کن مراحل سے گذریں اور آج ان کی حالت کیا ہے۔ قیمت ۳/- روپے

۱۳- جہاد اسلام کے اہم ترین اور اس کے ساتھ ہی نازک ترین موضوع پر مختصر لیکن جامع کتاب۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات۔ قیمت۔ دو روپے

۱۴- پاکستان کا معمار اول ہماری نئی نسل سرسید کے عظمت مقام سے ناواقف ہے۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ قیمت ۳/- روپے۔

۱۵- عربی خود سیکھئے قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اسلئے ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے آتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ یہ کتاب اس مقصد کیلئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۴/۵۰ روپے

۱۶- مقام حدیث یہ وہ کتاب ہے جس نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کا صحیح مقام متعین کرنے کیلئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت ۴/- روپے

۱۷- الفتنۃ الکبریٰ مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ قیمت۔ چھ روپے

یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی دیگر تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ ۲ - لاہور